

سرزمین اور باشندے

انگلستان

ایلیشیا سٹریٹ

سیّد علی ناصر زیدی

3732

LIBRARY,
Govt. Kulliyat-ul-Banat
15, Lake Road,
LAHORE.

قیمت پانچ روپے

3732

سرزمین اور باشندے

LIBRARY,
Govt. Kulliyat-ul-Banat,
15, Lake Road

انگلستان

تصنیف

الیشیا سٹریٹ

ترجمہ

علی ناصر زیدی

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز
لاہور پشاور حیدرآباد کراچی

Ac
3732
MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 16760
★ MAILSI ★
911.41
ال ی

This is an authorized Urdu translation of THE LAND OF THE ENGLISH PEOPLE by Alicia Street. Copyright, 1946, 1953 by Alicia Street, Published by J. B. Lippincott Company, New York, U. S. A.

(FIRST . ADITION

طبع اول ۱۹۶۳ء
تعداد ۲۱۰۰
طابع شیخ نیاز احمد
مطبع علمی پرنٹنگ پریس
قیمت فی جلد پانچ روپے

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

بہ اشتراک

موسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور ــــ نیویارک

تعارف

مشہور بات ہے کہ انسان سیر و سفر سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ دوسروں سے ملنے کے بعد اسے ان کی خوبیوں اور اپنی خامیوں کا اندازہ کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس زمانے میں بھی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ جب سفر تکلیف دہ اور پُرخطر تھا۔ آج کل جب تیز رفتار ذرائع حمل و نقل نے دنیا کے تمام ممالک کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ یہ امر اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہم دوسری اقوام کی تاریخ، سیاست، معیشت اور معاشرت کو سمجھیں۔ اس زمانے میں کسی بھی ملک کا دوسروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔

اس مقصد کو پورا کرنے نیز لطف اندوز ہونے کے لئے صاحبِ استطاعت لوگ دوسرے ملکوں میں پہنچتے ہیں اور وہاں کے باشندوں سے ملتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو اتنی فراغت یا فرصت نہیں وہ یہ ضرورت بڑی حد تک کتابوں سے پوری کر سکتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ایک ایسے طویل سلسلۂ کتب کی کڑی ہے، جس کا مقصد دنیا کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنا ہے۔

اہل انگلستان ہمارے لئے نئے نہیں، لیکن ہم نے انھیں اپنے ملک میں اپنے حاکم کی حیثیت سے پہچانا تھا۔ خود ان کے ملک میں ان کی کیا حیثیت ہے؟ اس کا اندازہ اس کتاب سے ہوگا۔ یہ ایک انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس کی مصنّفہ ایک ایسی خاتون ہیں جن کی پیدائش، پرورش اور تعلیم تو امریکا میں ہوئی لیکن اب وہ کافی عرصہ سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اہل انگلستان کو نہایت قریب سے دیکھا ہے، ان کے مسائل کا مطالعہ کیا ہے

اور ان کے حسن و قبح کو پرکھا ہے۔ چونکہ انھوں نے امریکہ، برطانیہ دونوں کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ اس لئے وہ ان دو عظیم ملکوں کے باشندوں کے درمیان تقابل بھی کر سکی ہیں۔

ان صفحات میں آپ کو برطانیہ کا جغرافیہ، وسعت، قدرتی وسائل، ڈھائی ہزار سال قبل مسیح سے اب تک کی مختصر تاریخ، باشندوں کی گھریلو زندگی، پیشے، ذاتی صفات مثلاً تنظیم رواداری اور اخلاق، گزشتہ جنگِ عظیم کی کیفیت اور اس قوم کے مستقبل کے متعلق ایک ایسا اندازِ فکر ملے گا جس میں پختگی کے علاوہ دلچسپی کی چاشنی بھی موجود ہے۔

زیرِ نظر کتاب تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانے کے لئے اپنے اندر گراں قدر معلومات کا خزانہ بھی رکھتی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ دنیا میں کوئی قوم وقار اور عظمت کس طرح حاصل کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے طلباء اور عام قارئین یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

مترجم

پیش لفظ

دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی۔ امریکی اور برطانوی اہل قلم فلموں کے علاوہ اپنی تحریروں کے ذریعے سے دونوں قوموں کو قریب تر لانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ مجھے ایک کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا جس نے یہ فرض تمام دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوبی سے انجام دیا۔ اس کتاب کا نام تھا "یو ایس اے[1] ایٹ ورک اینڈ پلے"۔ اور مصنفہ الیشیا سٹریٹ جنھیں میں اس وقت تک صرف "آؤٹ پوسٹ[2]" کی ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ برطانیہ میں رہنے والے امریکی باشندے یہ مختصر سا اخبار وہاں کے حالات سے متعارف کرانے کے لئے شائع کرتے تھے۔ الیشیا سٹریٹ "بکس اکراس دی سی[3]" کے حلقۂ لندن کی چیئرمین بھی تھیں۔ اہل انگلستان کو اس کتاب میں وہ سب کچھ مل گیا جو وہ اہل امریکا کی روزمرّہ زندگی اور زندگی کی اقدار کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔ میں خاصا معمّر امریکی ہوں لیکن مجھے بھی اس کتاب سے بعض بڑی پرانی باتیں معلوم ہوئیں جو مجھے معلوم نہ تھیں۔ میں نے اس میں اپنے ہم وطنوں کے متعلق ایسے حقائق پائے جنھیں میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا یا جنھیں میں نے محض فرض کر لیا تھا۔

U.S.A.. At Work and Play ــ۱ـه

The Outpost ــ۲ـه

Books across the Sea ــ۳ـه

جب ایک سلسلۂ کتب — "پورٹرٹس آف دی نیشنز"[1] — جس کا میں ہمیشہ مداح رہا ہوں، برطانیہ پہنچا اور میں نے دیکھا کہ برطانیہ کا مرقع الیشیا سٹریٹ نے پیش کیا ہے تو میں سمجھ گیا کہ اس کام کے لیے اس سے بہتر مصنفہ کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ امریکی لڑکی ویک فیلڈ، مشیگان میں پیدا ہوئی، وہ لارنس کی گریجویٹ ہے۔ جب وہ سار بون میں پڑھ رہی تھی تو اس کی ملاقات ایک انگریز نوجوان سے ہوئی اور اب وہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی متاہل زندگی گزار رہی ہے۔ وہ عرصۂ دراز سے یہ بات جانتی ہے کہ مشترکہ زبان کے باوجود ایک ترجمان کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں مسز سٹریٹ نے شہریوں اور فوجیوں دونوں کے سامنے لیکچر دیئے۔ انھوں نے نہ صرف اہل برطانیہ کو امریکا کے متعلق اور امریکیوں کو اہل برطانیہ کے متعلق (کیونکہ اس وقت تک برطانیہ میں بہت سے امریکی سپاہی جمع ہو گئے تھے) معلومات بہم پہنچائیں بلکہ ان بے شمار سوالات کے جوابات بھی دیئے جو دونوں طرف سے کئے گئے تھے۔ جب وہ اپنے والدین سے ملنے کچھ دنوں کے لئے امریکا آئیں تو مجھے ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ وہ جانتی ہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو دوسرے ملک کے متعلق کیا کچھ، نیز مختلف سوالات کے جوابات کس طرح دیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تجربے کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ان کے جوابات سوال کرنے والے کی استعداد کے مطابق ہوتے ہیں۔

مجھے یقین تھا کہ یہ کتاب بڑی اچھی ہو گی اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گی، جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو وہ میری توقعات سے بالا نکلی۔ میں بیس سال کی عمر سے برطانیہ آتا جاتا رہا ہوں۔ ہیرالڈ ٹریبیون کا نامہ نگار ہونے کی حیثیت سے یہ میرے فرائض میں شامل رہا ہے۔ اسی لیے میرا ایک دفتر لندن میں ہے اور دوسرا نیویارک میں۔ میں نے سالہاسال برطانیہ میں میلوں پیدل سفر کیا ہے اور ہر جگہ کے دلکش مناظر دیکھے ہیں۔ کئی بار میں صرف کرسمس منانے وہاں پہنچا ہوں۔ مجھے اس کتاب

---

[1] سلسلۂ کتب جس میں زیر نظر کتاب شامل ہے۔ Portraits of the Nations

میں نہ صرف وہ انگلستان ملا جس سے میں واقف ہوں۔ بلکہ کچھ اور بھی جو میں نہ جانتا تھا اور لطف یہ کہ ہر چیز نہایت سادگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہی اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے اس میں اہل انگلستان کی پوری داستان موجود ہے، تحریر میں نام اور تاریخیں کم استعمال کی گئی ہیں، تاہم تسلسل برقرار رہا ہے، مطلب یہ ہوا کہ لکھنے والی نے باتوں ہی باتوں میں انگلستان کی تاریخ لکھ دی ہے۔ یہ ہے انگلستان ایک امریکی کے نقطۂ نظر سے۔ اس ملک نے اپنے ماضی سے قوت حاصل کی اور وہ بغیر کسی ہراس کے مستقبل کا سامنا کرنے کو تیار ہے۔

جے لیمبرٹ بیکر

فہرست مضامین

پہلا باب

ملک اور اُس کی آب و ہوا

اہل امریکا جب یورپ کا نام لیتے ہیں تو ان کی مُراد ان دو جزیروں سے ہوتی ہے جو اس براعظم کے مغربی گوشے سے شمالی اوقیانوس میں ابھرے نظر آتے ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان جزیروں کے باشندے یورپ کو جزائر برطانیہ سے بالکل الگ سمجھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں برطانیہ میں یہ ہے اور یورپ میں وہ، برطانیہ کو اس چیز کی ضرورت ہے اور یورپ کو اس کی، وغیرہ وغیرہ۔ امریکیوں کے تعجب کی وجہ یہ ہے کہ رود بار انگلستان جو برطانیہ کو باقی یورپ سے جدا کرتا ہے، ایک جگہ صرف اکیس میل چوڑا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں یہ جزیرے برِاعظم یورپ ہی کا ایک حصہ تھے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ اب سے سینکڑوں سال پہلے جن جنگجو اقوام نے یورپ کو تاراج کیا اور جن میں کلٹی[1]، رومن، ٹیوٹن[2]، ڈین وغیرہ شامل تھیں سب کی سب برطانیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رود بارِ انگلستان نے ۱۸۰۳ء میں برطانیہ کو نپولین کے حملے سے محفوظ رکھا تاہم وہ ۱۹۴۰ء میں برطانیہ، بلجیم اور فرانس کے ان نوجوان مردوں اور عورتوں کو باز نہ رکھ سکا جو ہٹلر کے حملے کے نتیجے میں نازیوں سے بچنے کے لئے موٹر کشتیوں بلکہ معمولی کشتیوں تک میں بیٹھ کر ساحلِ انگلستان تک پہنچے۔ یہ سفر یقیناً بڑا خطرناک رہا ہوگا کیونکہ اس رود بار

---

[1] کلٹی (Celt) قدیم گالی قوم کی ایک شاخ اس میں برطانوی، کارنوالی، ویلزلی، آئرستانی وغیرہ شامل ہیں [2] Teuton قدیم جرمن قوم۔

کی ہوائیں اور رویئں بعض اوقات بڑی شدت اختیار کر لیتی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ان کوششوں میں کتنے مرد، عورتیں اور بچے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے البتہ بچ نکلنے والے برطانوی فوجیوں کی ڈنکرک سے مراجعت اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ برطانیہ یورپ سے واقعی بہت قریب ہے خواہ ہوائی سلسلۂ رسل و رسائل موجود ہو یا نہ ہو۔

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ برطانیہ یورپ کا جزو ہے۔ تاہم ان جزائر کی تاریخ یورپ کی تاریخ سے مختلف رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل برطانیہ بعض باتوں میں اپنے تئیں یورپ سے جدا سمجھتے ہیں، چونکہ سمندر نے ان کے جزیرے کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا، لہذا رود بار کے اس پار کے ملکوں کی بہ نسبت انھیں اپنی زندگی کو اپنے انداز میں ڈھالنے اور اپنی روایات قائم کرنے کا بہت موقع ملا۔ برطانیہ پر آخری حملہ اب سے تقریباً نو سو سال پہلے ۱۰۶۶ء میں ہوا۔ اس وقت سے اب تک اہل برطانیہ کو جب بھی کسی ملک سے جنگ کرنی پڑی ہے، انھوں نے زیادہ تر بحری جنگ کی ہے۔ سمندر ان کے لئے ایک حصار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) اور دوم (۱۹۳۹-۴۵ء) میں برطانیہ پر ہوائی حملے ہوئے۔ لیکن ان دو جنگوں کے سوا اہل برطانیہ کو لڑائیوں سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا اور انھیں اپنی تعداد نیز اپنی خوشحالی میں اضافہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اس طرح ان کے بعض خیالات دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں سے مختلف ہو گئے اور یہ فرق جتنا زیادہ ہوتا گیا، اتنا ہی اہلِ برطانیہ خود کو متحد اور اہل یورپ سے الگ تھلگ سمجھنے لگے۔

برطانیہ دو جزیروں پر مشتمل ہے۔ بڑے جزیرے کو برطانیہ کہتے ہیں اور یہاں کے باشندوں میں اہل امریکا کی طرح بہت سی نسلوں کا خون شامل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز۔ ہر حصے کے لوگوں کا ایسی ہی مخلوط نسلوں سے تعلق ہے، لیکن اس اختلاط میں امریکا کے مقابلے میں کہیں زیادہ وقت لگا۔ اس کے علاوہ بعض باشندوں کا خون نسبتاً صاف ہے۔ مثلاً اہل ویلز اور اسکاٹ لینڈ۔ اجنبی لوگ ان حصوں تک زیادہ نہ پہنچ سکے کیونکہ وہاں

کے باشندے باہر سے کسی کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے حصوں میں یورپ سے آنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں آباد ہوئے۔ انھوں نے مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کا ناتا جوڑا اور یہیں کے ہو رہے۔

الغرض برطانیہ میں اس وقت تین مختلف اقوام آباد ہیں۔ بیس لاکھ ویلش (ویلز کے باشندے) جن کا تعلق آئبیری[1] اور کلٹی نسلوں سے ہے اور جنھوں نے آج تک اپنی زبان و روایات محفوظ رکھی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں پچاس لاکھ اسکاٹ (اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے) رہتے ہیں جو ناردی اور کلٹی نسلوں سے مخلوط ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کا دار الحکومت ایڈنبرا دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے بعد انگریز آتے ہیں جن کی تعداد چالیس لاکھ کے قریب ہے۔ اور جن کے جسم میں کلٹی، رومی، اینگلوسکیسنی، ڈینش اور نورمن خون موجود ہے۔ ان میں فرانس، فلانڈرس اور دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں کا بھی تھوڑا سا میل ہے۔

اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی آبادی انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی مجموعی آبادی کی تقریباً تین گنی ہے تاہم رقبے کے اعتبار سے ریاست ہائے متحدہ امریکا برطانیہ کے مقابلے میں تقریباً چونتیس (۳۴) گنا ہے۔ برطانیہ کیلی فورنیا کے نصف سے کچھ بڑا ہے، اس کی شکل مثلث نما ہے۔ اور اس کی مشرقی سرحد شمال میں جون او گرزوٹس سے جنوب میں ڈوور، کینٹ تک صرف ساڑھے پانچ سو میل لمبی ہے۔ اس کی جنوبی سرحد ڈوور سے لینڈس اینڈ، کورنوال تک تین سو بیس میل لمبی ہے۔ انگلستان اور ویلز کا مجموعی رقبہ تقریباً اتنا ہی ہے جتنا ریاست جارجیا کا۔ برطانیہ کا کوئی مقام بھی سمندر سے پچھتر میل سے زیادہ دور نہیں، اندرون ملک میں کسان بھی اپنے کھیتوں پر اکثر بحری پرندوں کے غول منڈلاتے دیکھتے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ سمندر پر بڑی تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ خدا جہاز رانوں کی حفاظت کرے"۔

---

[1] (Iberian) ——— اس جزیرہ نما کا باشندہ جو ہسپانیہ اور پرتگال پر مشتمل ہے۔

اگرچہ اہل برطانیہ، خاص طور پر انگریز، امریکیوں کی بہ نسبت بہت ہی چھوٹے ملک میں رہتے ہیں اور ان کے قدرتی وسائل بھی محدود ہیں۔ تاہم ایک حیثیت سے وہ بڑے خوش قسمت ہیں اور یہ خوش قسمتی آب و ہوا کے سلسلے میں ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ پڑھ حیرت ہو کیونکہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ انگلستان کا موسم خراب رہتا ہے۔ وہاں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے، ہوا میں رطوبت زیادہ رہتی ہے اس لئے انگلستان میں دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بہت کم دھوپ نکلتی ہے۔ خشک ملکوں کے مقابلے میں وہاں کی دھوپ کمزور بھی ہوتی ہے اور ہوتی بھی ہے تو صرف اتنی دیر کہ کوئی اس سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ ان جزائر کا موسم مستقل طور پر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً آپ صبح بیدار ہوئے تو بارش ہو رہی ہے آپ برساتی اوڑھ کر باہر نکلے لیکن جب آپ دوپہر کو گھر واپس آئیں گے تو سورج یقیناً چمک رہا ہوگا اور وہ برساتی آپ کے لئے عذابِ جان ہو جائے گی۔ آپ نے دوپہر کا کھانا کھایا اور برساتی گھر چھوڑ کر پھر باہر چلے گئے۔ آپ دیکھیں گے کہ چار بجے پھر بارش ہونے لگی اور آپ بُری طرح بھیگ گئے انگلستان جیسے ملک میں جہاں مناظر قدرت عام ہیں اور مچھر تقریباً ناپید، سیر سپاٹے میں لطف آنا چاہیئے لیکن اکثر اوقات باہر نکل کر تکلیف ہوتی ہے۔ قطعی ممکن ہے کہ جب آپ دوپہر کا کھانا باندھ کر باہر جانے کی تیاری کر رہے ہوں اس وقت دن روشن اور گرم ہو لیکن جب آپ اسے کھانے بیٹھیں تو سرد ہوا کے ساتھ ساتھ بارش بھی شروع ہو جائے۔ ماہرینِ موسمیات کو اس وقت اپنے کام میں اور بھی دشواری پیش آتی ہے جب جنوری میں بعض اوقات جولائی جیسی گرمی اور جولائی میں جنوری جیسی سردی پڑنے لگتی ہے۔

اگرچہ انگلستان کا موسم تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ تاہم وہاں کی آب و ہوا مجموعی طور پر اچھی ہے۔ دنیا میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں قدرت انسان سے برسرِ پیکار نظر آتی ہے ـــ دریا اپنے کناروں کو توڑ کر ابل پڑتے ہیں، طوفان قصبوں اور شہروں کو تباہ کر ڈالتے ہیں، حشرات الارض فصلوں کو کھا کر برابر کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ سخت گرمی یا سردی

کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ انگلستان میں کم از کم ایسا نہیں ہے۔ وہاں گزشتہ دو ہزار سال کے عرصے میں انسان نے اپنے ہاتھوں سے جو کچھ بنایا سنوارا ہے وہ آفاتِ سماوی اور جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہے۔ قدیم گرجا گھر کبھی زلزلوں کی نذر نہیں ہوئے، نہ بلاخیز طوفانوں نے ان صدیوں پرانے باغیچوں کا کچھ بگاڑا ہے جو اس ملک کی زینت ہیں۔ آب و ہوا کی نرمی کتنے ہی مختلف طریقوں سے وہاں کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لوگ سارا سال سائیکل استعمال کر سکتے ہیں۔ گھروں میں جاڑوں اور گرمیوں کے لئے طرح طرح کی کھڑکیاں یا جالیاں استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگلستان کے باغیچوں میں لیکا اور بگونیا پھول عام طور پر ملتے ہیں۔ جنوبی ساحل پر کہیں کہیں تاڑ کے درخت بھی نظر آجاتے ہیں۔ موسم خزاں میں اکثر گیہوں کی کاشت کی جاتی ہے جس کے لئے زمین وسطِ سرما میں تیار کرتے ہیں۔ مویشی شاذ و نادر ہی باڑوں میں رکھے جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ انگلستان میں جاڑوں میں بہت زیادہ سردی یا گرمیوں میں بہت زیادہ گرمی نہیں پڑتی۔ امریکا میں ایسے مقامات ہیں جہاں جاڑوں میں پارہ صفر سے پانچ درجے نیچے گر جاتا ہے لیکن گرمیوں میں ۱۰۰ ڈگری فیرن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس انگلستان میں کم سے کم درجۂ حرارت ۳۰ ڈگری اور زیادہ سے زیادہ ۸۰ ڈگری ہوگا۔ پارہ ۷۰ ڈگری سے اوپر چڑھتا ہے تو وہاں گرمی کی لہر آجاتی ہے اور اگر کسی کمرے کا درجۂ حرارت ۶۸ ڈگری تک پہنچ جائے تو لوگ دروازے کھڑکیاں کھولنے لگتے ہیں تاکہ کسی صورت ٹھنڈی ہوا اندر آجائے۔

لوگ لندن کے کہر کو اکثر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ امریکا کے بعض حصوں میں انگلستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ کہر چھایا رہتا ہے۔ لندن کا کہر فضائی رطوبت کی وجہ سے گہرا نہیں ہوتا بلکہ اس میں لاکھوں بھٹیوں سے نکلے ہوئے کوئلے کے باریک ذرات شامل ہوتے ہیں۔ دھوئیں کی وجہ سے وہ زیادہ گہرا معلوم ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہاں

زیادہ گہرا کہر کم چھاتا ہے۔ اپنے کئی سال کے دورانِ قیام میں مجھے وہاں صرف ایک مرتبہ اتنے گہرے کہر سے واسطہ پڑا کہ گھر تک جانے میں دشواری پیش آئی۔ لندن کے کہر کو بدنام کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصے کہانیوں کے لئے اس کی ضرورت محسوس کی۔ لندن کی عورتوں کو کبھی کبھار ہی گھر کے تمام پردے دھونے پڑتے ہیں اور وہ خوش ہیں کہ کہر کی تمام تر برائیاں صرف کہانیوں کی کتابوں ہی تک محدود ہیں۔

لندن کے کہر کے علاوہ انگلستان کی بارش کے معاملے میں بھی مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ چونکہ وہاں اکثر ترشح ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ عام طور پر جب بھی بارش ہوتی ہے، مقدار کے اعتبار سے کم ہوتی ہے۔ اکثر اوقات پھوار پڑتی ہے، جس میں آپ گھنٹوں بھیگے بغیر چل پھر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی کھل کر بارش ہوتی ہے تو وہ بھی یہی کوئی دس منٹ تک؛ اس کے بعد پھر وہی پھوار پڑنے لگتی ہے، البتہ مغربی سکاٹ لینڈ کا معاملہ مختلف ہے۔ نیویارک میں ہر سال تینتالیس انچ اور شکاگو میں تینتیس انچ بارش ہوتی ہے۔ مغربی انگلستان میں کہیں کہیں ساٹھ انچ تک بارش ہوتی ہے۔ لیکن لندن کا اوسط پچیس انچ کا رہتا ہے۔ برطانیہ کا کوئی حصہ بھی امریکی ریگستان کی طرح خشک نہیں اور اگر وہاں دو ہفتے بغیر بارش کے گزر جائیں تو کسان گھبرا جاتے ہیں کہ یہ "خشکی" کہاں سے آگئی۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر بارش تھوڑی ہوئی تو مٹی میں اتنی نمی برقرار نہ رہے گی کہ فصلیں خشک موسم کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں۔

انگلستان کی آب و ہوا پر حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ یہ علاقہ کافی شمال میں واقع ہے۔ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بالمقابل نہیں بلکہ برفانی لیبرے ڈار کے سامنے ہے۔ درمیان میں سمندر حائل ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جب کینیڈا میں قطبی سرد ہوائیں چلتی ہیں تو اس وقت انگلستان کے باغوں میں بادِ نسیم سرسراتی ہے۔ وہاں کرسمس تک گلاب کے پھول

کھلے رہتے ہیں۔ اس حرارت کا خزانہ آخر ہے کیا جس نے جزائر برطانیہ کو یہ قدرتی حسن اور دولت بخشی ہے؟

یہ خزانہ "گلف سٹریم" ہے۔ گرم پانی کا یہ پر اسرار دریا سمندر کے اندر اندر شمال مشرق کی جانب بہتا ہے۔ اسی کی بدولت جزائر برطانیہ جاڑوں میں گرم رہتے ہیں اور ان کی آب و ہوا، لیبرے ڈار بلکہ یورپ تک سے مختلف رہتی ہے۔ گلف سٹریم کو چھو کر جو ہوائیں برطانیہ تک آتی ہیں وہ اسے جاڑوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قطب شمالی کی طرف سے کوئی سرد طوفان انگلستان کے سرسبز کھیتوں تک آ جاتا ہے۔ لیکن جنوب اور مغرب سے آنے والی حرارت جلد ہی اس برف کو پگھلا کر نباتات میں زندگی کی پہلی جیسی لہر دوڑا دیتی ہے۔ گلف سٹریم برطانیہ کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ اس کے نیلے اور گرم پانی پر چلنے والی تیز ہوائیں ان جزائر کے باشندوں کے لئے حیات نو کا پیام لاتی ہیں۔

دوسرا باب

جنوب کے خوش منظر اضلاع

آپ انگلستان میں ایک لطف سے محروم رہیں گے اور وہ محرومی یہ ہے کہ وہاں زمین کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں کھڑے ہو کر آپ یہ کہہ سکیں "اس جگہ مجھ سے پہلے کوئی شخص نہیں آیا"۔ امریکا جیسے بڑے ملک میں بھی اب ایسی جگہیں نادر ہوتی جا رہی ہیں اور برطانیہ کا توچپہ چپہ اب سے سینکڑوں سال پہلے چھانا جا چکا تھا۔

اس لطف کی بجائے انگلستان کا سیاح اس خیال سے مخمور ہو جاتا ہے کہ جس جگہ وہ کھڑا ہے وہاں اس سے پہلے کتنے ہی دوسرے لوگ کھڑے ہو چکے ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے قدیم باشندے، رومن سپاہی، جنگجو اینگلو سیکسن باشندے، خوبصورت ڈین، فرانس کے نارمن لوگ اور ان کی آئندہ نسلیں اس سرزمین کے حسن سے مسحور ہو چکی ہیں۔ ان سب نے اس ملک کو عزیز رکھا ہے اور اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے ہیں۔

نووارد بہت جلد اس ملک کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ انتہائی شمالی علاقے میں موسم گرما میں دن بڑے ہوتے ہیں۔ سمندر سے گرم و مرطوب ہوائیں آتی ہیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ میں خوبصورت درختوں، پھولوں اور چڑیوں کی بہتات ہے۔ سال کے زیادہ حصے میں چالیس پچاس قسم کے پھولوں کھلے رہتے ہیں۔ موسم بہار آتا ہے تو ان کی اقسام سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ورڈزورتھ اور دوسرے شاعروں نے ان کے حسن کے گیت گائے ہیں۔

یوم مئی کے گیتوں میں انگلستان کے سب سے پیارے پھول پریم روز کا ذکر ملتا ہے، جس کا رنگ پیلا اور خوشبو ہلکی بھینی ہوتی ہے، اس کی پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں جو پوری کھل جاتی ہیں اور انگلستان

کے موسم بہار کا اعلان کرتی ہیں۔ پرم روز کے بعد انگلستان کا دوسرا حسین پھول "کاؤزلپ" یا گاؤزبان ہے جو امریکا کے اسی نام کے پھول سے مختلف ہوتا ہے۔ زرد رنگ کی یہ ننھی ننھی گھنٹیاں اپنے نرم و نازک ڈنٹھلوں پر عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ ان کے بعد گھنٹیوں جیسے ہی نیلے رنگ کے "بلو بیل" قابل ذکر ہیں۔ جو تمام جنگلوں میں اس کثرت سے اُگتے ہیں کہ درخت نیلے رنگ کی جھیل پر کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔

انگلستان میں ہر جگہ پھول ہی پھول دکھائی دیتے ہیں۔ گیہوں کے کھیتوں کے چاروں طرف جنگلی پھولدار پودے باقاعدہ لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً نیلگوں، فوکس گلوز[ل]، سفید پینزی۔ سرخ کوکنار، جنگلی مٹر اور خوبصورت میری گولڈ۔ اونچی پہاڑیوں کے دامن میں گھاس کے ساتھ ساتھ بہت سے پھولدار پودے اُگتے ہیں ـــــ سفید اور نیلگوں بنفشہ، آئی برائٹ، گہرے نیلے رنگ کے ویرونیکا اور چھوٹے چھوٹے زرد پھول جنھیں " ایگس اینڈ بیکن[ل۲] " کہتے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں انگلستان کے جن شہروں پر بمباری ہوئی تھی وہاں بھی جنگلی پھولدار پودے اُگ آئے۔

سرسبز و شاداب درختوں اور پھولوں کی دلکشی کے ساتھ چڑیوں کے سہانے گیت اور بھی لطف کا باعث ہوتے ہیں۔ موسم بہار میں سب سے پہلے لگو آتی ہے۔ شاعر صدیوں سے اس کی آواز پر وجد کرتے رہے ہیں۔ موسم گرما کے آتے آتے لگو کا گلا پڑ جاتا ہے اور اس کے گیت مدھم پڑتے جاتے ہیں۔ اس وقت سکائی لارک کے گیت کانوں کو بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ چڑیا آسمان پر اتنی اونچی اڑتی ہے کہ نظر نہیں آتی لیکن اس کے میٹھے گیت برابر کانوں میں آتے رہتے ہیں۔ دوسری قابلِ ذکر چڑیاں سر شورہ اور بلبل ہیں۔ بعض لوگوں کو روبن بہت پسند آتی ہے۔ اگرچہ اس کی آواز زیادہ اچھی نہیں ہوتی۔ موٹی موٹی چھوٹی سی یہ چڑیا دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ امریکا میں بھی ایسی ہی ایک چڑیا پائی جاتی ہے جس کا منہ سرخ ہوتا ہے۔ وہ بھی روبن کہلانے لگی ہے، اگرچہ اس کی قسم مختلف ہے۔

ل Fox gloves

ل۲ Eggs and-bacon

انگلستان کے دیہی علاقوں کے خوبصورت ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کھیتوں کے چاروں طرف خاردار تار یا لکڑی کی باڑھ لگانے کے بجائے خاردار جھاڑیوں اگائی جاتی ہیں جن پر خوبصورت پھول آتے ہیں۔ جھاڑیاں زیادہ جگہ لے لیتی ہیں، اس لئے ہر سال انھیں تراش کر سیدھا کر دیا جاتا ہے۔ وہ اتنی گھنی ہوتی ہیں کہ مویشی کھیتوں میں نہیں گھس سکتے۔ جھاڑیوں کو اُگنے میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ اس طرح ان پر خاصی لاگت آجاتی ہے۔ اس کے باوجود برطانیہ کے لوگ جھاڑیوں کو خاردار تار پر ترجیح دیتے ہیں۔ چڑیاں ان میں اپنے گھونسلے رکھتی ہیں، جھاڑیاں ہوا کو روکتی ہیں۔ بارش زیادہ ہو تو ان کی جڑیں بہت سا فالتو پانی جذب کر لیتی ہیں اور بیج خراب ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

انگلستان کے باشندوں کو اپنے ملک کی ان تمام خصوصیات سے شدید محبت ہے، یہ لوگ زیادہ تر بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔ کسانوں کی تعداد نسبتہً بہت کم ہے۔ لیکن شہریوں کو بھی پھول اگانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ جہاں کہیں ممکن ہوتا ہے وہ ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا لیتے ہیں۔ شہروں کے بہت سے نوجوان اپنی چھٹیاں زراعتی کورسوں پر صرف کرتے ہیں۔ لیکچر سننے کے علاوہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ کھیتوں پر کام کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔ تکان کے باوجود وہ اس کام میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ اگرچہ انگلستان میں کاریں عام اور سستی ہیں۔ لیکن جب وہاں کے باشندے مناظر قدرت کی سیر کو نکلتے ہیں تو تیز رفتار کاروں کے بغیر ہی سیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنگلی پھولوں، دھوپ چھاؤں، پتیوں کے مختلف رنگ اور ایسے ہی دیگر مناظر کا صحیح لطف آہستہ آہستہ چل کر ہی اٹھایا جاسکتا ہے یا پیدل چلنا ایسا ہی گراں گزرا تو بس سائیکلوں پر بیٹھ کر سیر کو نکل گئے۔

اہل برطانیہ نے اپنے ملک کو ترقی دینے کے لئے بڑی محنت کی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں اس ملک سے اس قدر محبت ہے۔ ٹیکساس کے کاڈ بوائے پروفیسر فرینک ڈوبی کا قول ہے کہ قدرتی مناظر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنھیں انسانی ہاتھ نے مطلق

نہ چھُوا ہو اور دوسرے وہ جنکا حسن انسانی کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہو۔ امریکا کے اکثر اور برطانیہ کے کچھ مناظر میں دونوں قسموں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ بہت سی جگہ انسان نے جنگل صاف کردئے ہیں اور پہاڑوں میں کانیں کھودڈالی ہیں بغیر یہ کوشش کئے ہوئے کہ قدرتی حسن کی اس کمی کو کسی صورت پورا کر دیا جائے۔

انگلستان کے بہت سے قدیم جنگلوں کو صاف کیا جاچکا ہے، لیکن ان کی جگہ کھیتوں اور چراگاہوں نے لے لی۔ ان کے چاروں طرف اگر جنوب میں سبز باڑیں کھڑی نظر آتی ہیں تو شمال میں قدیم دیواریں یہ فرض انجام دیتی ہیں۔ کہیں کہیں نرم روپیچ دار چشمے ان کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں جن پر پتھر کے پرانے پل بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں شاہ بلوط کے جھنڈ بھی نظر آتے ہیں جنھیں غالباً کسی کسان نے اب سے پانچ سو سال پہلے اپنے مویشیوں کے لئے سایہ فراہم کرنے کی غرض سے لگایا ہوگا۔ کسانوں کے گھر ان چیزوں کے بنے ہوئے ہیں جو مقامی طور پر آسانی سے مل سکیں۔ مثلاً جہاں پتھر کی افراط ہے، وہاں بھدے پتھروں کے مکان، جہاں چکنی مٹی وافر ہے وہاں اینٹوں کے مکان اور چھتوں پر پھونس نظر آتا ہے جہاں سرکنڈے اگتے ہیں اور جہاں کہیں کانیں ہیں وہاں سلیٹ کی چھتیں بنائی گئی ہیں۔ ایسے مکانات ان مناظر کا ایک حصّہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ جس چیز کے بنے ہوئے ہیں وہ پہلے ہی وہاں موجود ہے۔ بہت عرصہ ہوا کسی آدمی نے ایک باغ لگایا ہوگا، اس کے وارث نے پہاڑی کی ڈھال پر اونچی دیواروں والا ایک باغ لگا دیا جس پر دھوپ سیدھی پڑتی ہے۔ اس کے پڑپوتے نے ایک تالاب بنادیا جس میں سوسن کے پھول اگے ہوئے ہیں اور جس کا پانی آس پاس کے پھولوں اور دیواروں کی عکاسی کرتا ہے۔

الغرض ایک نسل کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نسل یہاں کے مناظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی رہی۔ بعض لوگوں نے غلطیاں بھی کیں لیکن وقت نے ان غلطیوں کا ازالہ کردیا۔ مثلاً اٹھارویں صدی کے اواخر میں امرا یونان اور روم کے قدیم مندروں کی نقل کرتے

ہوئے اپنی ریاستوں میں بھی مصنوعی طور پر اسی قسم کے کھنڈر پیدا کرتے تھے۔ لیکن یہاں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ تازہ کھنڈر نظر کو اچھے نہیں معلوم ہوتے ہوں گے۔ لیکن مدتِ مدید گزرنے کے بعد اب وہ پتھر کالے ہو گئے ہیں اور ان پر کائی جم گئی ہے۔ اب وہ تمام کھنڈر اصلی ہوتے ہیں اور اپنے اندر ایک جاذبیت رکھتے ہیں۔

غالباً ایک اور وجہ سے بھی انگریزوں کو اپنے ملک سے بے انتہا محبت ہے اور وہ ہے مناظر کا تنوّع جو اس جزیرے میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ انگلستان کے یہ دلکش مناظر صرف ہر ضلع ہی میں مختلف نہیں ہیں بلکہ ہر تھوڑے فاصلے کے بعد بدل جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکا اور یورپ کے تمام مناظر تھوڑی سی جگہ میں مرکوز کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہاڑی نالوں کی اسکاٹ لینڈ میں کثرت ہے یا آدھی رات کا سورج دیکھنا ہو تو الاسکا یا ناروے کی راہ ڈھونڈنی پڑے گی تاہم شمالی انگلستان میں آپ کو ایسی جھیلیں اور کھیت مل جائیں گے جو ورماؤنٹ اور نیو ہمپشائر کی یاد تازہ کریں گے۔ جو لوگ کوہ اپالاشیان[لے] یا ایڈیرون ڈکس[ٹے] کے حسن کے دلدادہ ہیں وہ بھی ویلز، کمبرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے پہاڑوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں ہیں، لیکن وہ بڑے ناہموار ہیں۔ جو لوگ ایک دن میں پندرہ بیس میل آسانی سے چل لیتے ہیں وہ ان پر آسانی سے چڑھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں سطحِ سمندر سے ابتدا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے ساڑھے تین ہزار فٹ بھی بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

انگلستان کے ایک اور حصّے میں قدرتی مناظر بے حد مختلف ہیں۔ وہاں کے ہموار کھیت سطحِ سمندر کے نیچے ہیں اس لئے ان کی حفاظت کے لئے پشتے باندھنے پڑتے ہیں۔ اس علاقے کو "ہالینڈ کا حصّہ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہالینڈ سے بے حد مشابہ ہے۔

الغرض برطانیہ کے سیاح کو قدم قدم پر دوسرے ملکوں کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اور

ٹے Adirondacks

لے Appalachians

وہ رک جاتا ہے ـــــ کہیں فرانس جیسا ناہی گیروں کا گاؤں نظر آجاتا ہے، کہیں اسپین جیسی چپٹی پہاڑیاں اور کہیں وسکونسن جیسے ڈیری فارم۔ ہر موڑ پر آپ کو ایک نیا منظر دکھائی دیتا ہے۔

ان مناظر کی حیثیت عارضی نہیں ہے کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست ان چٹانوں اور اس مٹی سے ہے جس سے یہ جزیرہ بنا ہے۔ دنیا کے بعض حصوں میں سطح ارض کے تہ و بالا ہونے یا برفانی دور کے عظیم گلیشیروں کے آگے بڑھنے کی وجہ سے بڑا انقلاب آیا جس نے تمام قومی نقوش مٹا دیئے۔ برطانیہ میں ایسے انقلابات نے اپنا اثر تو چھوڑا ہے لیکن سابقہ نقوش کو نہیں مٹایا۔

اس تمام تر تنوّع کے باوصف برطانیہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک اونچا[1] اور دوسرا پست[2]۔ اگر آپ دریائے ٹیز[3] کے دہانے (جو انگلستان کے شمالی مشرقی ساحل پر واقع ہے) سے دریائے ایکس[4] (جو جنوبی ساحل کے مغربی کنارے تک پہنچتا ہے) تک ایک خط کھینچیں تو برطانیہ کا زیادہ تر اونچا حصّہ اس خط کے بائیں طرف رہ جائے گا اور زیادہ تر پست حصّہ دائیں طرف۔ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں پست علاقے میں رہنے والوں کی تعداد اونچے کوہستانی علاقے میں رہنے والوں کے مقابلے میں چھ گنی ہے۔

"پست علاقے" سے مراد صرف یہ ہے کہ اس کی سطح نیچی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے فرضی خط کے مشرق کی طرف پہاڑیاں بالکل نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگلستان کی بعض نہایت مشہور پہاڑیاں اسی علاقے میں واقع ہیں۔ تعجب ہے کہ ان پہاڑیوں کو "ڈاؤنز[5]" کہتے ہیں۔ مثلاً کینٹ، سرے اور سسیکس کے شمالی و جنوبی ڈاؤنز۔ جب انگریز کسی پہاڑی کو "ڈاؤن" کہتے ہیں تو ان کی مراد سمت سے ہرگز نہیں ہوتی۔ اس لفظ کا مطلب "پہاڑی" ہے اور اسی

---

[1] Highland [2] Lowland [3] Tees River
[4] Exe River [5] Downs

کا تعلق ایک قدیم لفظ سے ہے جو اینگلو سیکسن باشندے اب سے بارہ سو برس پہلے اپنے ساتھ یہاں لائے تھے۔

بایں ہمہ لفظ "ڈاؤن" ایک خاص قسم کی پہاڑی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے —— ایسی پہاڑی جو زیادہ تر چاک پر مشتمل ہو —— وہی چاک جس سے ہم تختۂ سیاہ پر لکھتے ہیں اگرچہ وہ کان سے نکلتے وقت اتنی سفید نہیں ہوتی۔ چاک والی مٹی میں کم فصلیں اگتی ہیں۔ البتہ گھاس خاصی نکل آتی ہے جسے بھیڑیں شوق سے کھاتی ہیں۔ چاک میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس سے ان کے جسم پر نہایت عمدہ اون آجاتی ہے۔ یہ پہاڑیاں سمندر تک چلی گئی ہیں، جہاں انھوں نے ان سفید چٹانوں کی شکل اختیار کر لی ہے جو نہ صرف ڈوور کے قریب پائی جاتی ہیں بلکہ انگلستان کے پورے جنوبی ساحل پر چھائی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ساؤتھ ڈاؤنز کے سبزہ زاروں پر چلیں تو آپ کو سات آٹھ سو فٹ کی گہرائی پر اپنے ایک طرف چمکدار سمندر نظر آئے گا اور دوسری طرف سرسبز و شاداب ویلڈ وادی جس کے خوبصورت کھیت اور قدیم گرجا گھر دیکھ کر آپ قائل ہو جائیں گے کہ اس علاقے میں چلنا پھرنا ایک قسم کی ورزش کے علاوہ ایک ولولہ انگیز تجربہ بھی ہے۔ اہل برطانیہ کو پیدل چلنے میں لطف آتا ہے، اس لئے ڈاؤنز پر سڑکوں کا نہ ہونا اچھا سمجھا جاتا ہے۔

شمالی اور جنوبی ڈاؤنز (جن کے درمیان ویلڈ کی زرعی وادی واقع ہے) کے مغرب میں چاک کا ایک اور خطہ ہے جس نے ساؤتھیمپٹن کو تقریباً چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جس سے بہت سے امریکی پہلی بار انگلستان میں داخل ہوتے ہیں۔ ساؤتھیمپٹن کی تعمیر چاک کے بجائے پست زمین پر ہوتی ہے۔ ہیرے جیسی شکل کا وائٹ جزیرہ اس کی گودی کی پوری حفاظت کرتا ہے۔ اس جزیرے کی لمبائی تقریباً بیس میل اور چوڑائی پندرہ میل ہے اور یہاں انگلستان کے بعض نہایت حسین مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ساؤتھیمپٹن کی اہمیت بہت کچھ اس جزیرے کی وجہ سے ہے جس کے دونوں طرف سے سمندری لہریں بندرگاہ کی طرف چڑھتی

ہیں - مدوجزر کی شدّت بڑے بڑے جہازوں کو بھی بندرگاہ میں داخل ہونے میں مدد دیتی ہے -

ساؤتھمپٹن کے باہر چاک کی پہاڑیاں پھر بلند ہو جاتی ہیں اور یہاں کا منظر سرے ، سیسکس اور کینٹ کے ڈاؤننز سے مختلف ہو جاتا ہے - اس خطۂ مرتفع (پٹھار) کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کاشتکاری ہو سکتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ زمین خراب ہے - اسی لئے اہل برطانیہ مدتوں سے اس خطے کو فوجی تربیّت کے لئے استعمال کر رہے ہیں - اسی جگہ سیلسبری میدان واقع ہے جو ہزاروں امریکی سپاہیوں کے ذہن میں محفوظ ہوگا کیونکہ فرانس پر حملہ کرنے سے قبل انھوں نے یہاں فوجی مشقوں میں حصّہ لیا تھا -

مغرب میں اور آگے بڑھیئے تو ڈورسٹ ، سمرٹ اور ولٹ شائر کی نہایت سبز وادیاں ملتی ہیں - ان کے آگے کچھ اور پہاڑیاں آتی ہیں - جنھیں منڈیپس کہتے ہیں - انگلستان کی سیر کرنے والوں کو اس رومانی غار کو دیکھ کر بڑا لطف آتا ہے جسے "چڈّر گورج" کہتے ہیں - یہاں چونے کے کئی غار ہیں - امریکیوں کو وہ چھوٹے معلوم ہوتے ہوں گے کیونکہ وہ کینٹکی کے عظیم غار دیکھ چکتے ہیں -

منڈیپس سے تھوڑے فاصلے پر برسٹل ہے - یہ شہر دریائے ایون پر تعمیر کیا گیا تھا - وہ اپنے دامن میں اس زمانے کی یادیں سمیٹے ہوئے ہے ، جب بادبانی جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے دور دراز ملکوں کا سفر کرتے تھے - اسی شہر کی بندرگاہ سے ۱۴۹۷ء میں جون کیبٹ نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوا تھا - اسی بندرگاہ پر سب سے پہلے امریکی نو آبادیوں سے آیا ہوا تمباکو ، نیل ، چاول اور پوستین کا بار اتارا گیا ہے - سان فرانسکو جیسا یہ پہاڑی شہر کافی خوبصورت ہے - اگرچہ ۱۹۴۱ء میں ہوائی حملوں سے اسے بہت نقصان پہنچا تھا - شمالی اور جنوبی امریکا کے بہت سے بحری جہاز اب بھی برسٹل کی بندرگاہ ہی پر آتے ہیں -

تیسرا باب

مشرقی اینگلیا اور وسطی علاقے

چونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کا رقبہ بہت زیادہ ہے اس لئے مختلف حصوں کے باشندوں کی زبان ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ نیویارک کے رہنے والے کا لہجہ ٹیکساس کے باشندے سے مختلف ہے کیونکہ دونوں ریاستوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ اہل امریکا کو تعجب ہوتا ہے تو اس بات پر کہ برطانیہ میں محدود رقبے کے باوجود لب و لہجہ کا بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ وہاں کے عوام ایک ہی جیسے اخبار پڑھتے ہیں، ایک ہی ریڈیو سٹیشن کے پروگرام سنتے ہیں اور ایک ہی قسم کی فلمیں دیکھتے ہیں پھر بھی وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں جو صرف مقامی طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ان الفاظ کا تلفظ اپنے طور پر بدل لیتے ہیں۔ جو لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہیں، وہ انگریزی صرف و نحو اس حد تک مسخ کر دیتے ہیں کہ امریکا کے ان نو واردوں میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی جنھوں نے حال ہی میں انگریزی سیکھنی شروع کی ہے۔ کورنوال اور یارک شائر کے گلہ بان مشکل سے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح لندن اور لیورپول سکاچ۔ آئرش پولس کے سپاہی ایک دوسرے کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ ایبرڈین لندن کے مختلف حصوں۔ ناروچ اور ڈورسٹ وغیرہ میں مختلف مطالب بیان کرنے کیلئے مختلف محاورے استعمال کئے جاتے ہیں۔ انگلستان کے بعض شہروں تک کے تلفظ میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً خود شروس بری[1] کے لوگ اسے شروس بری کہہ کر پکارتے ہیں۔

---

[1] Shrewsbury

برطانیہ میں آنے والے غیر ملکیوں کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سے جزیرے میں انگریزی اتنے فرق کے ساتھ کیوں بولی جاتی ہے۔ اس کے خاص اسباب تو غالباً عادت اور گھریلو ماحول ہیں۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کچھ اور وجوہ کو بھی دخل تھا۔ انگلستان میں ریل جاری ہوئے سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا ہے۔ اس سے قبل سفر تکلیف دہ اور مہنگا تھا۔ کسانوں کو دوسرے علاقے کے باشندوں سے ملنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ پہاڑوں پر سڑکیں نہیں تھیں۔ وہاں جو تھوڑے بہت لوگ آباد تھے وہ صدیوں سے الگ تھلگ رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ انھیں کبھی نئے الفاظ یا محاورے ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی لیکن جب پست علاقے[1] میں غیر ملکی باشندے آکر آباد ہوئے تو ہر ضلع کی زبان مختلف ہو گئی۔ اہل ڈنمارک نے نویں صدی میں انگلستان کا بیشتر حصّہ فتح کر لیا تھا۔ فلیمنگ باشندے مشرقی اضلاع میں آکر آباد ہو گئے۔ اسی طرح سترھویں صدی میں کچھ فرانسیسی بھاگ کر یہاں آگئے۔ اس طرح غیر ملکیوں نے یہاں کی زبان اور یہاں کے عوام کے رسم و رواج نیز کردار پر اپنا نقش قائم کیا اور انھیں ایک بڑی حد تک بدل دیا۔

اسی طرح زیریں برطانیہ کے لوگوں نے مقامی ادبی اور دوسری سرگرمیوں کے علاوہ بعض دوسری دلچسپیوں میں بھی حصّہ لینا شروع کر دیا۔ اگر وارک شائر کے سرسبز علاقے سے شکسپیئر نہ بھی اُٹھا ہوتا جب بھی وہ قابل دید علاقہ تھا کیونکہ وہاں کی زبان، وہاں کے گیت، وہاں کے رسم و رواج ــــــ سب کے سب اپنی انفرادی خصوصیت رکھتے ہیں۔ مشرقی اینگلیا وہ علاقہ ہے، جہاں کے رہنے والے شروع میں امریکا جاکر آباد ہوئے اب جو امریکی ادھر آتے ہیں وہ اس جگہ کی تاریخ سے دلچسپی لینے کے بجائے یہاں کے

---

[1] Lowland

مناظر اور یہاں کے لوگوں کی معاشرت سے مسحور ہو جاتے ہیں۔

مشرقی اینگلیا روزمرّہ گفتگو میں تو اکثر استعمال ہوتا ہے لیکن نقشے پہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک زمانہ تھا کہ انگلستان میں سات سلطنتیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے نام ابھی تک فراموش نہ ہو سکے مثلاً مغربی سکسیوں کی سلطنت "وسیکس" کہلاتی تھی۔ یہ لفظ ابھی تک استعمال ہوتا ہے اور وسیع علاقے کا احاطہ کرتا ہے جس میں ہیمپ شائر (جس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے) کا چاک کا خطۂ مرتفع، ولٹ شائر، گلاؤسسٹر، ڈورسٹ اور سمرسٹ شامل ہیں۔ اسی طرح مشرقی اینگلیا کسی زمانے میں مشرقی اینگلز[۱] کی قلمرو میں شامل تھا۔ وہ ضلع اسیکس (لندن سے ٹھیک مشرق میں)، کے زیادہ حصے، نارفوک اور سفوک نامی دو اضلاع (یعنی نارتھ فوک اور ساؤتھ فوک) اور کیمبرج شائر پر مشتمل ہے۔

زمانۂ قدیم میں مشرقی اینگلیا تقریباً ایک جزیرہ تھا۔ اس کے مشرق اور شمال میں سمندر واقع تھا اور جنوب میں واش نامی علاقے سے آگے دلدل ہی دلدل تھی جس پر سڑکیں تعمیر نہ ہو سکتی تھیں۔ مشرقی اینگلیا آنے والوں کو ایک گھاٹی میں سے گزرنا پڑتا تھا جو جنوب مغرب میں واقع تھی۔ اب سے دو ہزار سال پہلے رومن عہد میں بھی اس گھاٹی کی سڑک پرانی تھی۔ قدیم باشندوں کے نام کی رعایت سے وہ اب بھی "اکنیلڈ وے"[۲] کہلاتی ہے۔

زمانۂ جنگ میں یہ سڑک اور اس کا قبضہ زبردست اہمیت کا حامل تھا۔ رومنوں نے اس کے جنوبی سرے کی حفاظت کے لیے ایک فوجی چوکی قایم کی تھی جو کولچسٹر کہلاتی ہے کولچسٹر اب بھی ایک فوجی مقام ہے اگرچہ اب وہاں رہنے والے سپاہی اُن سپاہیوں سے قطعی مختلف ہیں جو رومنوں کے بنائے ہوئے سرخ قلعے میں کیمپ تھے۔ وہ قلعہ اپنی جگہ اب بھی موجود ہے۔ آس پاس کے اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں اس کی سیر کے لئے آتے ہیں۔

---

[۱] Eastern Angles

[۲] Icknield Way

یہاں انھیں رومنوں کے ہاروں، انگوٹھیوں، شیشے کے گلدانوں، پانی کے برتنوں، اوزاروں اور سکوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس وقت برآمد ہوئیں جب وقتاً فوقتاً یہاں کی سڑکیں مرمت کی گئیں یا دیواریں گرائی گئیں۔

اب کولچسٹر کے شمال میں کسی قسم کی پہاڑیاں باقی نہیں ہیں بلکہ میلوں تک وسیع کھیت ہی کھیت ہیں جن کی مٹی گہری اور زرخیز ہے۔ جنوبی مغربی حصے کے کھیت جاڑوں میں پالے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ کسانوں کی ضرورت کی بارش بھی یہاں ہو جاتی ہے اور پورے برطانیہ میں اتنی دھوپ کہیں نہیں پڑتی جتنی یہاں پڑتی ہے۔

قرونِ اوسط میں تمام مشرقی اضلاع میں بھیڑیں پالی جاتی تھیں جن کی اون مشرقی بندرگاہوں اپلوچ، الڈبرگ، ساؤتھ وولڈ، یارماؤتھ وغیرہ سے بلجیم بھیجی جاتی تھی جہاں اُسے کات کر اس سے کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی اینگلیا کے باشندوں نے خود اپنی اون کو کاتنا اور بننا سیکھ لیا۔ کسانوں کی بیویاں اور بیٹیاں اونی دھاگا تیار کرتی تھیں۔ ہر گھر میں ایک دو کرگھے لگ گئے۔ پھیری لگانے والے جلاہے گھر گھر آکر کپڑا تیار کرنے لگے اور اس طرح "انگریزی کپڑا" بہت سے تہذیب یافتہ ملکوں میں جانے لگا۔ مشرقی اینگلیا کے یہ محنتی کسان اس قدر امیر کبیر ہو گئے کہ انھوں نے ہر دیہات میں ایک ایک شاندار گرجا گھر تعمیر کر ڈالا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے گوتھک طرزِ تعمیر کے یہ حسین نمونے آج بھی اسی طرح سر اٹھائے نظر آتے ہیں اگرچہ ماضی کے وہ خوشحال دیہات بہت کچھ تبدیل ہو گئے ہیں۔

جب مشینیں ایجاد ہو گئیں اور کپڑا دستی کرگھوں کی بہ نسبت کم وقت اور زیادہ مقدار میں تیار ہونے لگا تو مشرقی اینگلیا کی اون کی تجارت زوال پذیر ہو گئی۔ مشرقی اضلاع کوئلے کی کانوں سے بہت دور تھے۔ چنانچہ یارک شائر کے اون کے سوداگروں کو اپنے سابقہ حریفوں پر سبقت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مشرقی اینگلیا کے باشندوں کے پاس

ان کے زرخیز کھیت اب بھی تھے اور انھوں نے جلد ہی متعدد فصلیں —— گیہوں، جڑیلی اشیا، جو، رائی اور سیم وغیرہ —— اگانے کا اتنا عمدہ طریقہ نکال لیا کہ دوسرے کسان بھی ان کی نقل کرنے لگے اور اٹھارویں صدی کے شروع میں انگلستان سے غلّہ برآمد ہونے لگا۔ اس وقت سے اب تک مشرقی اینگلیا زرعی اعتبار سے باقی تمام اضلاع سے آگے رہا ہے اگرچہ گزشتہ جنگِ عظیم میں برطانوی اور امریکی فضائیہ نے اس کی سینکڑوں ایکڑ نفیس زمین کو ہوائی اڈّوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

انگلستان میں مشرقی اینگلیا ہی ایسا حصّہ ہے جس میں "فینس"[1] نامی علاقہ شامل ہے۔ اور جو اِن وسیع دلدلوں پر مشتمل ہے۔ جو واش کے جنوب میں واقع ہیں۔ ان دلدلوں کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اب سے صدیوں پہلے ان دلدلوں میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ٹاپو اُبھر آئے جن پر تارک الدّنیا لوگ، کالے پانی کی سزا پانے والے اور کچھ مقامی باشندے رہنے سہنے لگے۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کا سامان کر لیتے ہیں۔ سب سے بڑے جزیرے کا نام "اِلی" تھا جہاں کچھ پادریوں نے مل کر ایک بہت بڑا گرجا تعمیر کیا۔

جس طرح دنیا کے دوسرے دلدلی علاقوں میں گھومنا پھرنا اور ان کے متعلق تحقیقات کرنا آسان کام نہیں اسی طرح فینس بھی پراسرار بنا رہا۔ کسی نے وہاں جانے کی جرأت نہ کی کیونکہ اس طرح نہ صرف اس کے وہاں گم ہو جانے کا خطرہ تھا بلکہ وہاں کے قدیم باشندے بھی باہر سے کسی کا آنا جانا پسند نہ کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی ہار نہ مانی کیونکہ یہ علاقہ ان کے لیے بڑی اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا۔

وقت اور محنت نے فینس کو بہت کچھ تبدیل کر دیا۔ برطانیہ کے قدیم باشندوں اور رومنوں نے اس کے کچھ حصّوں کا پانی نکال کر انھیں خشک کر لیا۔ پھر ۱۶۳۰ء میں پہلی

---

[1] Fens

مرتبہ یہ کام بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا۔ ارل آف بیڈ فورڈ نامی ایک زمیندار نے جزیرہ ای لی کے چاروں طرف کی زمین خشک کرنے کے لیے ایک جماعت تیار کی۔ بالکل اسی طرح جیسے ولندیزیوں نے اپنی دلدلوں کو خشک کیا۔ ایک ولندیزی انجینئر نے اس جماعت کو یہ مشورہ دیا کہ دلدلوں کا پانی کھینچنے کے لیے اکیس میل لمبی اور ستر فٹ چوڑی ایک نہر نکالی جائے۔ بیس سال بعد پہلی نہر کے متوازی ایک اور نہر کھودی گئی۔ اس طرح جو زمین حاصل ہوئی اس پر جلدی گھاس اُگ آئی اور کہیں کہیں قیمتی فصلیں پیدا ہونے لگیں۔

مقامی باشندوں کو یہ انقلاب ناگوار گزرا۔ اُن کے پیشوں مثلاً ماہی گیری، ٹوکریاں بنانا چڑیماری اور ایسے ہی دوسرے مشاغل میں فرق پڑ گیا چنانچہ وہ برسوں ان بیرونی مزدوروں سے نبرد آزما رہے۔ پانی خشک ہونے پر بہت سی زمین سطح سمندر سے نیچی ہو گئی جیساکہ ہالینڈ میں ہوا تھا۔ سمندر کی دست برد سے محفوظ رہنے کے لیے یہاں بھی پشتے تعمیر کرنے پڑے۔ پانی کو خارج کرنے والی نہریں بھی اس زمین سے اونچی ہو گئیں۔ ان میں پانی ڈالنے کے لیے بھی پمپ لگائے گئے۔ جو ہالینڈ کی طرح ہوا کے زور سے چلتے تھے مقامی باشندوں نے ان پشتوں کو بڑا نقصان پہنچایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس منصوبے پر وقت اور سرمایہ بہت زیادہ صرف ہوا۔

ان مشکلات کے باوجود دلدلیں خشک کرنے کا کام برابر جاری رہا۔ جب پہلا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو دوسرا شروع کر دیا گیا۔ بالآخر انگلستان کے رقبے میں تقریباً اسّی میل لمبے اور تیس میل چوڑے علاقے کا اضافہ ہو گیا۔ صرف ایک دو قطعے خشک ہونے سے رہ گئے ہیں۔ بعض پمپ تقریباً سو سال سے برابر چل رہے ہیں اور کچھ نئے پمپ لگائے جا رہے ہیں۔ اس علاقے میں اب تجارتی پیمانے پر گیہوں، جئی، آلو، چقندر، سرسوں پھل اور پھول وغیرہ اگائے جاتے ہیں۔

مشرقی اینگلیا کے اس پست علاقے کے مقابلے میں وسطی علاقہ نہایت مختلف ہے جو یارک کے ساتھ مثلث بناتا ہے۔ برسٹل اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور واش اس کا تیسرا ضلع ہے۔ وسطی علاقے کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں — شمال میں پینینا اور مغرب میں کوہِ ویلش ہے۔ کارپ لینڈز نامی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ جنوب سے شروع ہو کر لنکن شائر اور یارک شائر کے مشرقی ساحل تک چلا گیا ہے۔ یہ انگلستان کا قلب ہے جس میں زیادہ تر زراعت ہوتی ہے۔ ہر ضلع کا صدر مقام کسی دریا پر واقع ہے تاکہ تمام کسان اپنی پیداوار وہاں لا سکیں۔ وسطی علاقے میں اب تک بہت سے کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے برمنگھم کے چاروں طرف آبادی میں اس تیزی سے اضافہ ہوا ہے کہ لندن کے بعد یہی علاقہ سب سے زیادہ گنجان شمار ہوتا ہے۔

اگرچہ وسطی علاقے کا زیادہ تر حصہ چراگاہوں یا زرخیز کھیتوں پر مشتمل ہے تاہم کہیں کہیں کوئی چٹان یا کوئلے کی کان بھی نظر آجاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کان کونٹری کے لیے کوئلہ مہیا کرتی ہے اور دوسری برمنگھم کے لیے۔ شروڈ فوریسٹ کے قریب اب کارخانے بن گئے ہیں جہاں کبھی روبن ہُڈ گھومتا پھرتا تھا۔ یہاں کی پرانی صنعتوں کو قومی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لسسٹر کے موچی اپنے ہاتھوں سے جوتے بناتے تھے جن کے لیے وہ کسانوں سے چمڑا خریدتے تھے۔ یہ کسان جاڑوں کے لیے گوشت محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے مویشی ذبح کرتے تھے۔ اب لسسٹر میں نہ صرف پورے برطانیہ کی ضرورت کے جوتے تیار ہوتے ہیں بلکہ وہ جفت سازی کی مشینوں کا بھی مرکز ہے۔ نارتھمپٹن اور کیٹرنگ جیسے جفت سازی کے دوسرے مرکزوں کا دارومدار بھی اسی شہر پر ہے۔

اگرچہ وہ دن گذر گئے لیکن پرانے قصبات میں اب بھی ماضی کی جھلک نظر آجاتی ہے مثلاً شروس بری میں اب . . . .

بھی ایسے نفیس مکانات موجود ہیں جو آدھے لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور جو ملکہ الزبتھ اوّل کے عہد میں بھی پرانے ہو چکے تھے۔ روتھ ویل میں ایک ایسی منڈی ہے جو ۱۵۷۷ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ تقریباً ایک درجن مقامات پر عمدہ ٹاؤن ہال موجود ہیں۔ جدید محلّوں میں سولھویں اور بیسویں صدی کی عمارتیں شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ قدیم و جدید چیزوں کے اس حسین امتزاج نے انگلستان کو یک گونہ امتیاز بخشا ہے۔ یہ امتزاج صرف وسطی علاقے کے صنعتی شہروں میں ہی نہیں ملتا بلکہ دوسرے مقامات پر بھی دیکھنے میں آتا ہے۔

چوتھا باب

برطانیہ کا کوہستانی حصّہ

ٹیز اور ایکس کو ملانے والے خط کے مغرب اور شمال میں برطانیہ کا کوہستانی علاقہ واقع ہے، جہاں لوگوں کو بالعموم جفاکشی کی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ قدرت کے ساتھ جنگ کرتے کرتے بہت قوی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی تعداد کے مقابلے میں برطانیہ کی زندگی پر کہیں زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اس علاقے میں سکاٹ لینڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کے حسن اور تاریخ پر علیحدہ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہاں کے لوگ کہتے ہیں "ہم تو سرخ ہرن جیسے ہیں ہمیں تو صرف بندوق کی گولی ہی روک سکتی ہے"۔ اور یہ بات سچ ہے جرمنی اور جاپان کے جو سپاہی اسکاٹ لینڈ کی فوجوں (جنھیں لیڈیز فروم ہیل[ل] کہتے تھے کیونکہ وہ اپنی وردی کے ساتھ ساتھ جیسا لہنگا بھی پہنتے تھے) کے خلاف لڑے، اس بات پر متفق ہیں کہ کبھی کبھی ایک گولی کافی نہ ہوتی تھی۔

سکاٹ لینڈ کے علاوہ برطانیہ کے کوہستانی علاقے میں تین نہایت اہم اضلاع بھی شامل ہیں جو سرحد کے جنوب میں واقع ہیں۔ یہ جزیرے نما انگلستان کے مغربی ساحل سے باہر نکلے ہوئے ہیں یعنی کورنوال، ویلز اور کمبرلینڈ کا لیک ڈسٹرکٹ۔ ان اضلاع سے اس ملک کی بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ کورنوال کا شاہ آرتھر، اس کے گول میز والے نائٹ اور اس کا مشہور شہر کیملوٹ، ویلز کے سجاٹ اور آگے شمال میں ان مطلق العنان نوابوں کا ملک آتا

[ل] Ladies from Hell

ہے جو کسی کی برتری تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ اپنے علاقے پر خود حکومت کرتے تھے اور نہایت بہادری سے بیرونی حملوں کا مقابلہ کرتے تھے۔

انگلستان میں ڈیون اور کارنوال کی وہی حیثیت ہے جو امریکا میں کیلی فورنیا کی ہے لیکن یہ جنوب ترین اضلاع کیلی فورنیا کے کسی بھی حصّے کے مقابلے میں کہیں زیادہ شمال میں واقع ہیں۔ وہ اسی عرض البلد پر ہیں جیسے برٹش کولمبیا۔ برطانیہ میں درجۂ حرارت کا اتنا کم فرق کہیں نہیں پایا جاتا جیسا یہاں ملتا ہے۔ کورنوال میں تو گرمیوں اور جاڑوں کے درجۂ حرارت میں تقریباً کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ وہاں کے لوگوں کو شاذ و نادر ہی برف دکھائی دیتی ہے اور نہ وہاں اتنی گرمی پڑتی ہے کہ زمین تپنے لگے۔ کورنوال اور ڈیون کے ساحلوں پر غسل کرنے میں لطف آئے گا۔ لیکن بہت سے امریکی وہاں صرف دھوپ سے لطف اندوز ہونا پسند کریں گے۔ یہاں کی گھاٹیوں میں بہت سے پرسکون گوشے مل سکتے ہیں۔

ہر شخص ایسی جگہ رہنا پسند نہ کرے گا، جہاں کا درجۂ حرارت مستقل طور پر ۵۰ ڈگری کے آس پاس رہے، لیکن کورنوال اور ڈیون میں موسم سرما کی نرمی پھلوں اور پھولوں کی کاشت کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی ہے۔ اس علاقے میں کیلی فورنیا اور فلوریڈا کی طرح پھل، ترکاریاں اور پھول کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں کی ضروریات بھی یہاں سے پوری ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں کاشت نہیں ہو سکتی وہاں پھولدار جنگلی پودے کثرت سے اُگ آتے ہیں۔ فروری میں پہاڑی ڈھلان زرد رنگ کے پھولوں سے ڈھک جاتی ہے، جس کا جی چاہے انہیں توڑے اور لندن کے بازاروں میں فروخت کے لیے بھیج دے۔ تھوڑے دنوں بعد ڈیفوڈِل[۱] پھول نکل آتے ہیں۔ جن کے پودوں کی کاشت

---

[۱] Daffodil

بھی کی جاتی ہے اور خودرو بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ٹیولپ، پیوپائن، گلیڈیول اور گلِ داؤدی اپنی اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

اس حسن و ملاحت کے برعکس کورنوال اور ڈیون کی تاریخ اور وہاں کے باشندوں کا کردار خاصا سخت ہے۔ کورنوال کا ساحل کوہستانی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں پر بھوری پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ جنگجو سمگلروں کی آماجگاہ تھا۔ ان چٹانوں پر بعض بدکردار لوگ روشنی کرکے بیٹھ جاتے تھے تاکہ بادبانی جہاز اِن سے آکر ٹکرائیں اور وہ ان کا مال اسباب لوٹ لیں۔ اسی علاقے میں کچھ دلیر ماہی گیر بھی رہتے تھے جو شکار کی تلاش میں کھلے سمندر پر نکل کھڑے ہوتے تھے اور بعض اوقات اپنے فرانسیسی حریفوں سے ڈٹ کر لڑتے بھی تھے لیکن جب ۱۹۴۰ء میں فرانس کو شکست ہوئی تو یہی حریف دوست بن کر کارنوال کی بندرگاہوں میں داخل ہوئے اور یہاں پناہ لی۔

کارنوال کے لوگ کلٹی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اسی لیے وہ انگریزی کے بجائے اسی قوم کی زبان بولتے تھے۔ بعض لوگوں کے خون میں ہسپانیہ کی تھوڑی سی آمیزش ہے جس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آرمیڈا کی تباہی کے بعد بچ نکلے تھے۔ آرمیڈا نے ۱۵۸۸ء میں انگلستان پر حملہ کیا تھا تاہم کورنوال کے باشندوں کا خون انگریزوں کے مقابلے میں صاف ہے (کورنوال اور ویلز کے لوگ اپنے آپ کو انگریزوں سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں) جس زمانے میں سڑکیں تھوڑی اور خراب تھیں کورنوال لندن سے بہت دور سمجھا جاتا تھا اسی لیے بادشاہوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ سوائے کلیوں کے جنھوں نے اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے کورنوال اور ویلز کے قدیم باشندوں کو یہاں سے باہر نکال دیا تھا، کوئی دوسرے حملہ آور ان اضلاع کو مکمل طور پر تسخیر کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اسی لیے وہاں کے باشندوں پر رومنوں، اینگلو سیکسنوں، اہل ڈنمارک

اور نارمن لوگوں کی تہذیب کا مطلق اثر نہ ہُوا حالانکہ ان غیر ملکیوں نے برطانیہ کے دوسرے حصّوں کو بڑی حدتک متاثر کیا ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ قدیم قصّوں کہانیوں سے ٹنٹاجل پر شاہ آرتھر کے قبضے کا پتا چلتا ہے جہاں اب بھی ایک چٹان پر ایک قدیم محل کے آثار موجود ہیں ۔ دراصل شاہ آرتھر کلیوں کا ایک عظیم رہنما تھا اور اس نے انھیں اینگلوسیکسنوں کے حملوں سے بچائے رکھا ۔

کورنوال میں برطانیہ کی بعض قدیم ترین چٹانیں پائی جاتی ہیں اور وہاں کی مٹی بھی دوسرے پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ زرخیز ہے ۔ وہاں پہاڑ نہیں ہیں البتہ کہیں کہیں چراگاہوں کے درمیان ایک آدھ چٹان سر اٹھائے نظر آتی ہے ۔ براؤن ولی، رف، ٹور وغیرہ ایسی ہی چٹانوں کے نام ہیں جو بعض بنجر علاقوں میں تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی تک چلی گئی ہیں ۔

ان بنجر علاقوں میں خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اگتا لیکن ان پر بھی سال کے بیشتر حصے میں پھول کھلے رہتے ہیں ۔ لوگ دور و نزدیک سے انھیں دیکھنے آتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ ان اضلاع میں مونٹانا نامی ایک ریگستان بھی واقع ہے وہ بھی بنجر ہے لیکن اس کا رنگ قدرے مختلف ہے ۔

انگریزی زبان میں مختلف مناظر کی تصویر کشی کے لیے اتنے کثیر الفاظ موجود ہیں کہ ماہر زبان ان سے بہت محظوظ ہوتا ہے لیکن ایک عام امریکی قاری سمجھنے میں دقّت محسوس کرتا ہے ۔ جس طرح برطانوی باشندوں کو امریکی محاورے سمجھنے میں دقّت ہوتی ہے اسی طرح امریکی بھی انگلستان کے مناظر کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے ۔ برطانیہ کے ہر ضلع میں مختلف چیزوں کے نام مختلف ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر علاقے کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جو دوسرے علاقے میں نہیں پائی جاتیں ۔ مثلاً ڈیون میں کچھ ایسے پھولدار پودے اُگتے ہیں، جن سے سکاٹ لینڈ محروم ہے ۔ اسی طرح درخت

اور چٹانیں تک مختلف ہیں۔

کورنوال، ڈیون اور سمرسٹ کو عام طور پر "مغربی ملک[1]" کہتے ہیں، لیکن ڈیون اور سمرسٹ میں کورنوال کے مقابلے میں کہیں کم جنگل پائے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ بھی باقی انگلستان سے متعلق رہی ہے۔ کورنوال کلٹی قوم کا مرکز رہا لیکن ڈیون اور سمرسٹ میں پہلے سکیسنوں نے اور پھر نارمنوں نے اپنی نوآبادیاں قایم کیں۔ نارمن باشندوں سکیسنوں پر غالب رہے۔ چار سو سال تک ڈیون اور مغربی سمرسٹ کے باشندے کا گذارہ اون کی تجارت پر ہوتا رہا۔ جب صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مشرقی اینگلیا کی تجارت زوال پذیر ہوئی تو مغربی ملک میں اون کی صنعت بھی تباہ ہوگئی۔ ڈیون، کورنوال اور سمرسٹ میں قوت کا کوئی ارزاں خزانہ میسّر نہ تھا۔ ان کے بندرگاہ اتنے بڑے نہ تھے کہ ان میں دخانی جہاز داخل ہوسکیں۔ کورنوال اور ڈیون دونوں میں رانگ کو کانوں سے نکالنے کا کام اتنا مہنگا ہوگیا تھا کہ اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغربی وادیوں میں کچھ عرصے تک زندگی نہایت مشکل رہی۔ لوگ اس خوبصورت حصۂ ملک کو خیرباد کہہ کر یکے بعد دیگرے امریکی نوآبادیوں، کینیڈا اور بعد میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو ہجرت کرگئے۔

کاریں اور ٹرک عام ہونے پر اس علاقے کی قسمت پھر جاگ اٹھی۔ سیاحوں کی آمد سے مقامی باشندوں کو خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اور وہ اپنے پھل پھول تیز رفتار گاڑیوں میں دور دور تک بھیجنے لگے۔ اس سے پہلے یہ چیزیں راستے ہی میں سڑ گل جاتی تھیں۔ انگلستان میں ڈیون شائر کی اسٹابیری اس قدر پسند کی جاتی ہے کہ اب اسے قومی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

بعض دوسری صنعتوں کو بھی کھوئی ہوئی اہمیت دوبارہ حاصل ہوگئی ہے۔ کچھ نئی صنعتیں بھی نئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قائم ہوگئی ہیں۔ مثلاً رانگ کی کانیں

---

[1] The West Country

اتنی پرانی ہیں کہ ان میں سے بعض ۵۵ سنہ قبل مسیح کے رومن حملوں سے پہلے بھی موجود تھیں، اگرچہ ۱۹۲۲ء تک رانگ کی کچی دھات افراط سے موجود تھی لیکن بعض کانیں اس قدر گہری ہوگئی تھیں اور انھیں خشک رکھنے پر اس قدر لاگت آتی تھی کہ رانگ نکالنے کا کام بڑا مہنگا ہو گیا، اس کے علاوہ کچھ کان کن قدامت پسند تھے۔ وہ کان کنی کے نئے طریقے استعمال نہ کرتے تھے ورنہ لاگت کچھ کم آتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ملایا کا رانگ درآمد ہونے لگا اور مغربی ملک کے بہت سے کان کن بے روزگار ہوگئے۔ اُس وقت سے حالات اسی طرح اچھے برے ہوتے رہے۔ ملایا کا رانگ مہنگا ہونے لگا۔ اور جب دوران جنگ میں جہاز رانی معرض خطر میں پڑ گئی تو کورنوال اور ڈیون سے رانگ، سنکھیا اور ٹنگسٹن[1] پھر نکالا جانے لگا۔ بعض کانیں اب پھر پوری رفتار سے کام کر رہی ہیں اور باقی کو بھی درست کیا جا رہا ہے۔

کورنوال اور ڈیون سے چینی مٹی بھی حاصل ہوتی ہے جو برتن بنانے کے علاوہ کاغذ اور سوتی سامان میں نفاست اور وزن پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔

ڈیون کا صدر مقام ایکسیٹر نامی خوبصورت شہر ہے جہاں بہت سے گرجا گھر بھی ہیں لیکن امریکیوں کو پلی ماؤتھ زیادہ پسند آتا ہے۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جہاں سے ۶ ستمبر ۱۹۲۰ء کو زائرین[2] مے فلاور میں نئی دنیا (امریکا) کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔

ڈیون کا ایکس مور ایک رومانی افسانے "لورنا ڈون از بلیک مور[3]" کا مرکز رہا ہے۔ یہ افسانہ لاکھوں نوجوانوں میں مقبول رہا ہے۔

ڈیون سے شمال مغرب میں سفر کر کے جب ہم ویلز میں داخل ہوتے ہیں تو انگلستان پیچھے رہ جاتا ہے اور ہم ایک نئی سرزمین میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ علاقہ چھوٹا ہے، آبادی کم

---

[1] ایک کمیاب دھات جو رنگ میں فولاد سے مشابہ ہوتی ہے۔ [2] Pilgrims

[3] Blakmore

ہے لیکن اس کا حسن منفرد ہے اس کی اپنی زبان ہے ، اپنی تاریخ ہے اور اپنی جداگانہ تہذیب ہے ۔ شمالی ویلز کوہستانی ہے ۔ یہاں کے دیہات ایک دوسرے سے میلوں دور ہیں ۔ اُدھر سے کم لوگوں کا گذر ہوتا ہے ۔ کہیں کہیں مقامی کسان پتھر کی پرانی دیواروں کی مرمّت کرتے نظر آتے ہیں ۔ موسمِ سرما میں یہاں کی سرسبز وادیوں میں کہر اور بارش کا قبضہ ہو جاتا ہے اور قدیم سنوڈن نیز آس پاس کی پہاڑیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں موسم گرما میں سورج کی تمازت میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ کوہ پیما اس کی شدّت کو محسوس کرتے ہیں جو سنوڈن کی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر کچھ شربت پانی پیئں ۔ شوقیہ تیرنے والے بحیرہ آئرلینڈ میں زور زور سے ہاتھ پیر مارتے نظر آتے ہیں ۔ بحیرہ کے اوپر ہالرچ کا قدیم سیاہی مائل محل ابھی تک کھڑا ہے ۔

امریکا کے تمام کان کنوں میں جنوبی ویلز کے کان کن ملتے ہیں جو بڑے مستقل مزاج اور محنتی ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے وطن میں بڑی گہری کانیں کھود چکے ہیں ۔ جنوبی ویلز تقریباً تمام تر سطح مرتفع پر واقع ہے ۔ کوئلے کی کانیں دریاؤں کی کاٹی ہوئی تنگ گھاٹیوں میں ہیں ۔ وہیں کان کنوں کے چھوٹے چھوٹے سیاہ گھر بھی نظر آتے ہیں جن کی چھتیں کھپریل کی ہیں ۔ یہاں سٹیم انجن ایجاد ہونے سے پہلے بھی ریلوے لائن استعمال ہوتی تھی ۔ کوئلہ ڈبوں میں بھر دیا جاتا تھا اور وہ ڈھلواں لائن پر خود ہی دوڑتے ہوئے نیچے وادی کے منہ تک پہنچ جاتے تھے ۔ اس سرزمین کے رنگین مناظر اور آسمان کی وسعت تاریک دیہات سے نہیں دکھائی دیتی ، اس لیے بہت سے لوگ تنگ راستوں سے گزر کر خطۂ مرتفع کے کنارے تک پہنچتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں ۔

خوشحالی کے دور میں بھی ویلز کے دیہات میں فراغت کے کوئی خاص آثار نظر نہ آتے تھے ۔ لیکن بعد میں حالات اور بھی خراب ہو گئے ۔ بحری جہاز کوئلے کے بجائے تیل استعمال کرنے لگے اور ویلز کی کوئلے کی تجارت ماند پڑ گئی ۔ کانیں بند ہو گئیں ۔ کسی دوسری صنعت

سے ان کی جگہ نہ لی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال بے روزگاروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ کچھ کان کن لندن چلے گئے اور وہاں دوسرے بیکار کان کنوں کے ساتھ مل کر سڑکوں پر اپنی سریلی آواز میں ویلز کے گیت سنانے لگے۔ گیت کے بعد وہ اپنے ہیٹ تماشائیوں کے سامنے پھیلا دیتے تھے تاکہ رات بسر کرنے کے لیے سرائے کی چارپائیوں کا کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم مہیا ہو سکے۔ وہ اور ان کے بال بچے اس وظیفے پر زندہ رہتے جو انگلستان میں بے روزگاروں کو ملتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان ویلز کے کان کنوں پر ایسی مسرت کا دور گزرا ہے جسے وہ کبھی فراموش نہ کریں گے۔

ویلز کے لوگ انگریزوں اور امریکیوں کے مقابلے میں اپنے شاعروں، مغنّیوں اور مقررین کا کہیں زیادہ احترام کرتے ہیں۔ صدیوں سے ویلز کے گاؤں میں ہر سال ایک مقابلہ منعقد ہوتا ہے جس میں ایسے باکمال افراد کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں کامیاب ہونا وہاں اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے، جیسے امریکی قومی فٹ بال ٹیم میں منتخب ہونا۔ اہل ویلز کھیل کے میدان میں بھی پیچھے نہیں ہیں۔

ویلز کے لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں دل لگا کر کرتے ہیں۔ وہ مذہب کے بھی بڑے دلدادہ ہیں۔ اتوار کو ٹرینیں اور بسیں سب کی سب رک جاتی ہیں۔ مرد، عورتیں اور بچے سیاہ کوٹ، سیاہ ٹوپیاں، سیاہ موزے، جوتے اور دستانے پہن کر آہستہ آہستہ گرجا گھر کی طرف رواں نظر آتے ہیں، جہاں سے ان کی میٹھی آواز پوری وادی میں گونج جاتی ہے۔ اس دن ہنسنا بولنا اور مذاق کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ گھر کے سب افراد شام کو پیانو کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور صرف حمد گاتے ہیں۔ ہفتے کے باقی دن اہل ویلز نہایت خوش و خرّم رہتے ہیں۔

امریکا میں بھی اور انگلستان میں بھی شمالی اور جنوبی علاقے کے لوگ اپنے عادات واطوار اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انگریزوں سے واقف ہونے

کے لیے صرف اہل لندن کو جان لینا ہی کافی نہیں بلکہ لیورپول اور مانچسٹر کے باشندوں کو بھی سمجھنا ضروری ہے اہل مانچسٹر فخریہ انداز سے کہتے ہیں۔ "آج مانچسٹر کے ذہن میں جو بات ہے، وہ انگلستان کی سمجھ میں کل آئے گا۔" خواہ اہل لندن متفق نہ ہوں لیکن یارک شائر اور لنکا شائر میں جدید طرز کی ایسی بستیاں، کارخانے اور سکول موجود ہیں کہ جنوبی علاقہ ان کے مقابلے میں گرد ہے تاہم یہ صورت صرف کہیں کہیں ہے۔ شمال کے بعض شہر نہایت غلیظ اور بدنما ہیں۔

اہل انگلستان کا انحصار بہت کچھ شمال کی زراعت اور کارخانوں پر ہے۔ شمالی انگلستان میں بلند و پست دونو طرح کا علاقہ شامل ہے۔ اول الذکر میں پہاڑ، خوبصورت لیک ڈسٹرکٹ اور پینی ہلز کا سلسلہ واقع ہے جو اسکاٹ لینڈ کی طرح سے انگلستان کے وسط تک چلا گیا ہے اور ایک مشہور پہاڑی "دی پیک" پر ختم ہوتا ہے۔ شمالی پست علاقے میں لنکاشائر کا میدان قابلِ ذکر ہے جو بحیرہ آئرلینڈ سے شروع ہو کر چالیس پچاس میل تک اندرونِ ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ آگے چل کر وہ مڈلینڈ پلین[1] سے مل گیا ہے۔ یہاں لنکاشائر کے درجن بھر صنعتی شہروں لیورپول کے قرب و جوار کے صابن کے کارخانوں اور کیمیاوی اداروں، سینٹ ہیلنز کے کانچ کے کارخانوں، مقامی کانوں، ریشم کے کارخانوں نیز ظروف سازی کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کے لیے غلّہ پیدا ہوتا ہے۔

پینائنز کے مشرق میں یارک شائر کا جنگلی بنجر علاقہ واقع ہے یارک شائر کے تین مختلف اضلاع رائڈنگ[2] کہلاتے ہیں۔ پرانی زبان میں اس کے معنی تیسرے کے ہیں۔ یارک شائر کا کوئی جنوبی حصّہ نہیں۔ صرف شمالی، مشرقی اور مغربی حصّے ہیں۔ مغربی حصّے میں اون کے وہ کارخانے ہیں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے مشرقی اینگلیا اور ڈیون شائر کی تجارت کو

---

[1] Midland Plain

[2] Ridings

زک پہنچائی تھی ۔ یارک شائر میں کوئلا افراط سے موجود تھا ۔ اس لیے یہاں صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہوا ۔

یارک کا شمار انگلستان کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا ہے ۔ وہاں ایک تیرہ سو سال پرانا گرجا ہے ، شہر پناہ پتھر کی ہے اور نہایت قدیم ہے ۔ یہ شہر رومنوں کی آماجگاہ رہا ہے ۔ انھی نے وہ عظیم دیوار تعمیر کی تھی جو اب بھی انگلستان کے شمال میں سولوے فرتھ سے دریائے ٹائن تک کھڑی ہے ۔ اس زمانے میں اسکاٹ لینڈ میں رہنے والے پکٹ بڑے جنگجو تھے ۔ صدیوں تک اس سرحد پر ان کے ساتھ لڑائی ہوتی رہی ۔ اب امن وامان ہے لیکن قدیم دیواریں اور محلات اس دور کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں ۔ شمالی باشندوں کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ ان کی رگوں میں عسکری خون گردش کر رہا ہے ۔

پانچواں باب

برطانیہ میں گھریلو زندگی

یہ مکان سرخ اینٹ کے بنے ہوئے بہت سے مکانات کی ایک قطار کے درمیان کھڑا ہے جو سب کے سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ان کے بالمقابل ایسی ہی ایک اور قطار ہے۔ آدھی سڑک پار کرکے آپ کو اس قطار میں تھوڑا سا خلا ملے گا۔ یہاں دو تین مکانات پر ۱۹۴۰ء میں بمباری ہوئی تھی۔ انگلستان کے باقی مکانات کی طرح ہمارا یہ مکان جدید طرز کا ہے جو اب سے غالباً چالیس سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔ اس کی تعمیر اچھی ہے، کھڑکیاں بڑی بڑی ہیں، سامنے کا دروازہ سیاہ اور چمکدار ہے جس کا دستہ پیتل کا ہے۔ کمروں کی چھتیں اونچی ہیں اور وہ اندر سے خوب ہوادار ہیں۔ انگلستان کے لاکھوں عوام اس قسم کے مکان کو "گھر[1]" کہتے ہیں۔

یہ اس زمانے میں تعمیر ہوا تھا، جب ایجاد و اختراع کو ذہانت کے بجائے کاہلی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں برتن دھونے کی ایک لمبی سی جگہ ہے جو عقبی پائیں باغ تک چلی گئی ہے، پرانے طرز کا ایک باورچی خانہ ہے، جس میں پانی گرم کرنے کے لیے کوئلے کا ایک چولھا ہے۔ کھانا پکانے کے لیے گیس کا انتظام ہے۔ ایک بڑی مربع میز پڑی ہے، ایک الماری ہے، برتن رکھنے کے لیے ایک کھلی الماری اور دو پرانی کرسیاں رکھی ہیں۔ ایک کرسی پر عام طور پر گھر کی سیاہ بلی بیٹھی رہتی ہے۔ انگلستان میں

---

[1] Home ے

کالی بلیاں باعثِ برکت سمجھی جاتی ہیں۔

مکان کے سامنے کے حصّے میں بیٹھک ہے۔ آتش دان کے سامنے آرام کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ جاڑوں میں شام ہی سے آتش دان میں کوئلا جلا دیا جاتا ہے۔ کھڑکی کے سامنے ایک تہہ ہو جانے والی میز رکھی ہے۔ ایک کونے میں پیانو ہے، جس کے دونوں طرف ایک شمع دان کھڑا ہے۔ آتش دان کے قریب ایک چھوٹی میز ہے جس پر ایک ریڈیو رکھا ہے۔ کھڑکیوں پر سفید جالی کے پردے پڑے ہیں۔ ان کے پیچھے ریشمی پردے ہیں جو صبح کو ہٹا دیے جاتے ہیں اور رات کو برابر کر دیے جاتے ہیں۔

آدھا زینہ طے کر کے ایک بڑا غسل خانہ آتا ہے جس کا رنگ سبز اور زرد ہے۔ اس میں چھ فٹ لمبا نہانے کا ایک ٹب ہے جس کے پیر خوبصورت اور خم دار ہیں۔ ہاتھ دھونے کے لیے ایک سفید بڑا تسلا رکھا ہے اور گرم پانی کے نل کے چاروں طرف ایک الماری بنی ہے۔ باقی نل دوسرے کمرے میں ہیں۔

دوسری اور تیسری منزلوں میں دو دو خواب گاہیں ہیں ایک بڑی اور دوسری چھوٹی۔ تین کمروں میں گیس کے ہیٹر لگے ہیں۔ سب سے اوپر کی منزل میں بچوں کے لیے ایک بڑا کمرہ ہے جس میں گیس کے بجائے کوئلے کا آتش دان ہے، جس کے چاروں طرف جالی لگی ہے۔ سونے کے ہر کمرے میں ہاتھ دھونے کے لیے تسلہ موجود ہے، کپڑوں کے لیے الماریاں ہیں کیونکہ سارے گھر میں غسل خانہ صرف ایک ہے جو زینے میں ہے اور جہاں گھر کے تمام افراد ہوائی حملے کے وقت پناہ بھی لیتے تھے۔

زینے کی تبیس[۳۲] سیڑھیاں چڑھنا، اُترنا، آتش دانوں میں کوئلہ لگانا اور انھیں صاف کرنا، پندرہ فٹ دور لے جا کر باورچی خانے کے تمام برتن دھونا، کھانے کا کمرہ ٹھیک رکھنا یہ سب کے سب کام صرف ایک عورت کے بس کے نہیں ہیں۔ اس مکان میں مسز سمتھ رہتی ہیں۔ وہ یہ سب کام کرتی رہیں لیکن جب انھیں لڑائی کے زمانے میں کچھ اور کام بھی لینا

پڑا تو انھیں اس مکان کے نقائص کا احساس ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں وہ دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں اور اسی میں مگن تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر صبح آتش دان صاف کرتے وقت بڑی گرد اڑتی تھی، پھر تیسری منزل تک کوئلے کی بالٹی اٹھا کر لے جانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن افرادِ خانہ کے آرام کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ سب لوگ شام کو ایک جگہ بیٹھ کر ریڈیو سنتے تھے اور آگ کے رقصاں شعلوں سے محفوظ ہوتے تھے بچوں کے کمرے میں ہر روز آگ جلانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنا اترنا آسان کام نہ تھا لیکن مسز سمتھ کو وہ بھی مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔

جب بچے چھوٹے تھے تو مسٹر اور مسز اسمتھ انھیں سائیکل پر باہر کی سیر کراتے تھے ایک دفعہ تو انھوں نے سائیکلوں ہی پر تیس میل کا سفر طے کیا لیکن جب گھر میں ایک کار آ گئی تو وہ دن فراموش ہو گئے۔ اس کے بعد جنگ چھڑ گئی اور شہریوں کو اپنی کاروں کے لیے پیٹرول ملنا بند ہو گیا تو سائیکلوں پر پھر پہلے جیسا لطف آنے لگا۔ مسز سمتھ کی باسٹھ سالہ والدہ گریٹی جونز نے بھی جو ایک دو میل کے فاصلے پر رہتی تھیں، اپنی سائیکل نکال لی وہ خوش خوش اپنی اس سائیکل پر سپاہیوں کی کینٹین میں پہنچتی تھیں اور وہاں سبزیاں کترتی تھیں۔

مسز اسمتھ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ انگلستان میں ان کے رہن سہن میں امریکی عورتوں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے دقتیں اور مشکلیں تھیں۔ کئی سال گزرے ان کی چھوٹی بہن رھوڈ آئی لینڈ میں ایک امریکی تاجر کی سیکرٹری بن کر چلی گئی تھی۔ اس نے وہیں شادی کر لی۔ جب وہ ۱۹۳۷ء میں تاجپوشی کے موقع پر اپنے عزیزوں سے ملنے آئی تو اس نے بتایا کہ اس کے باورچی خانے میں کیسی کیسی چیزیں ہیں جن سے سب کام بغیر کسی محنت کے ہو جاتا ہے، کپڑا دھونے کی مشین ہے، محرابیں ہیں لیکن گھر پھر بھی خوب گرم رہتا ہے مسز اسمتھ نے یہ سب باتیں بڑی دلچسپی سے سنیں اور سوچا کہ اگر کپڑا دھونے کی ایک مشین

خرید لی جائے تو بچوں کے کپڑے دھونے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ بڑے کپڑے لانڈری چلے جایا کریں گے کیونکہ انگلستان کی نم دار ہوا میں ان کا سوکھنا مشکل ہوتا ہے۔ باقی چیزوں کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ انگلستان کے بجائے امریکا کے لیے ہی موزوں ہیں مثلاً اُن کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ جاڑوں میں ریفریجریٹر کیوں چلایا جائے۔ ان دنوں تو کھانے کی سب چیزیں خود ہی ٹھیک رہتی ہیں۔ مسز سمتھ کو یقین تھا کہ کمرے میں کھلا آتش دان نہ ہو تو کھڑکیاں بند کرنے سے اندر کی ہوا بند ہو جاتی ہے۔ انھیں اپنی چھوٹی بہن گرٹ روڈ کے باورچی خانے کا ساز و سامان اچھا تو معلوم ہوا لیکن ان کا اپنا فرنیچر پرانا ہونے کے باوجود تھا بڑا آرام دہ۔ وہ اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی تھیں۔

اگرچہ گرٹ روڈ اپنی بڑی بہن کو قدامت پسند سمجھتی تھی لیکن جہاں تک بچوں کی پرورش کا تعلق تھا، وہ ان کی بڑی مداح تھی۔ ان کے بچے بلند قامت، خوبصورت اور تندرست تھے۔ بالکل فرشتہ معلوم ہوتے تھے لیکن ان کے اطوار فرشتوں جیسے نہ تھے البتہ خالہ کو وہ بڑے خاموش، خلیق اور پیارے معلوم ہوتے تھے کیونکہ اس کے اپنے بچے بڑے شوخ و شریر تھے۔ غالباً انگلستان کے گھروں اور سکولوں میں امریکا کی نسبت تمیز تہذیب سکھانے میں کہیں زیادہ سختی برتی جاتی تھی۔ یہاں بچوں سے بہت کم مشورہ کیا جاتا تھا اور امریکا کی نسبت گھریلو معاملات میں ان کی رائے بہت کم دریافت کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود کسی بچے کو کوئی گلہ یا شکایت نہ تھی۔

تمام بچوں کو جن میں نو سالہ نینسی اور چھ سالہ ٹوٹی بھی شامل تھا، بہت تھوڑا جیب خرچ ملتا تھا، پھر بھی کوئی کمائی کی فکر نہ کرتا تھا۔ ڈینس تو چودہ سال کا ہو چکا تھا۔ امریکا میں اتنے بڑے لڑکے کچھ اور نہیں تو اخبار ہی بیچ کر کچھ کما لیتے ہیں۔ بارہ سالہ جینی کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ امریکا میں بعض لڑکیاں پاس پڑوس کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا معاوضہ قبول کر لیتی ہیں۔ اس کی نظر میں یہ چیز بہت بُری تھی۔

اگرچہ انگلستان کے اسکولوں کی اونچی جماعتوں میں پڑھنے والے بچے اپنے ہم عمر امریکی بچوں کے مقابلے میں تقریباً دو سال آگے ہوتے ہیں تاہم بڑی خالہ کا یہ خیال تھا کہ امریکا کے مقابلے میں ان کا سوشل تجربہ بہت کم تھا۔

۱۹۳۷ء میں ان خالہ کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے باعث یہی بچے ایک دو سال کے عرصے میں امریکی بچوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ سمجھ دار ہو جائیں گے، چاہے ان میں اتنی شان پیدا نہ ہو۔ سمتھ گھرانا ایک بڑے شہر کے باہر رہتا تھا۔ وہ علاقہ "محفوظ" سمجھا جاتا تھا اس لیے یہاں کے بچوں کو دوسرے ہزاروں شہری بچوں کی طرح دوسرے اضلاع میں نہ پہنچایا گیا۔ نہ یہ گھرانا شہر کے مرکز سے اتنا دور تھا کہ یہاں کچھ پناہ گزین آکر آباد ہوتے اگرچہ مسز سمتھ سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے گھر میں دو بچوں یا ایک ماں اور اس کے چھوٹے بچے کو پناہ دینے کے لیے تیار رہیں۔

مسز سمتھ کے بچوں کو نہ تو خود کسی اجنبی گھر میں جانا پڑا اور نہ کسی اجنبی کو اپنے ہاں پناہ دینی پڑی تاہم انھیں بہت سے نئے حالات سے مطابقت اختیار کرنی پڑی۔ ایک تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ ڈنکرک کے فوراً بعد ان کے والد نے فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ اگلے موسم خزاں میں فضائی حملے شروع ہو گئے۔ محفوظ اور غیر محفوظ سب ہی علاقے ان کی زد میں آ گئے۔ یہ طیارے اپنے دفاع کی خاطر ہر جگہ بمباری کرتے تھے۔ ٹوبھی اور نینسی تو اپنے خوف پر قابو پا لیتے تھے۔ لیکن ڈینس اور جینی اپنی ماں کو تکنے لگتی تھی جو بیحد پریشان معلوم ہوتی تھیں جب صبح کے چار پانچ بجے خطرہ دور ہو جانے کی اطلاع ملتی تھی تو جینی رات بھر کی تکان کے باوجود کود کر کھڑی ہو جاتی تھی اور کہتی تھی "امی میں آپ کے لیے چائے تیار کرتی ہوں"۔ ڈینس سوتے ہوئے چھوٹے بھائی بہنوں کو اٹھا کر بالائی منزل میں پہنچاتا تھا۔ بمباری کی وجہ سے بہت سے مکانات تباہ ہو گئے۔ مسز سمتھ کے گھر کی بھی بالائی چھت اڑ گئی، کھڑکیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور سارے گھر میں گرد اور دھواں بھر گیا۔ اس وقت جینی ہی دونوں

چھوٹے بچوں کو گرتنی کے گھرلے گئی اور پھر واپس آکر صفائی ستھرائی میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ڈینس نے جلدی سے کچھ کرمچ نکال کر کھلی کھڑکیوں پر تان دی تاکہ جب تک مرمت نہ ہو اس وقت تک بارش اور سردی سے تو نجات رہے۔

۱۹۳۷ء میں خالہ گریٹ روڈ کو ان باتوں کا مطلق اندازہ نہ ہوسکتا تھا۔ ابھی جنگ نے ان بچوں کی صلاحیتوں کو نہیں آزمایا تھا، پھر بھی وہ انھیں پسند کرتی تھیں۔ اگرچہ ان میں اور ان کے والدین میں بہت زیادہ بے تکلفی نہ تھی تاہم انگریز اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ جب سخت دور آیا تو خالہ گریٹ روڈ کو اکثر جینی کی تیرھویں سالگرہ کا خیال آتا تھا۔

جینی نے اس موقعے پر عمر کا خیال کیے بغیر چند مہمان منتخب کیے تھے۔ مثلاً ان میں پچھتر سال کی بڑھیا مسز تومس، ایک جوان جوڑا مسٹر اور مسز ایڈورڈز اور تین سالہ گریگری تین بھی شامل تھا جو نہ اچھا کھیلتا تھا اور نہ رات کو دیر تک جاگتا تھا۔ مصیبت آنے سے قبل گریگری اور اس کی میزبان خوب کھیلتے رہے۔ ان سب کے علاوہ اس موقع پر گرتنی، خالہ گریٹ روڈ اور چچا فِل بھی شریک تھے جو پچھلی جنگِ عظیم میں اپنی خدمات سرانجام دے چکے تھے اور بہرے ہو گئے تھے، مسز اسمتھ کے بچے ان سب کے علاوہ تھے۔ جینی کے سکول کے دوست اور سہیلیاں بھی شریک تھیں۔

یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ پہلے سب بچے کاغذ پنسل کی مدد سے کچھ کھیل کھیلتے رہے پھر انھوں نے کچھ کھایا پیا۔ سینڈوچ، پنیر، آلو کی ورقیاں، ادرک کا شربت، چاکلیٹ اور آئس کریم وغیرہ۔ پھر کچھ ایسے کھیل کھیلے گئے جن میں صرف ایک کھلاڑی کو انعام ملنے کے بجائے ہر کھلاڑی کو ایک ایک انعام ملا۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کو تو سُلا دیا گیا اور باقی بچے پہیلیاں بوجھنے لگے۔ جینی نے کہا کہ انگلستان کی تاریخ سے ہیروئن خاتونوں کے نام گنائیے۔ سب کو فلورنس نائٹ انگیل

کا خیال آیا کیونکہ رات کا وقت تھا۔ مسز اسمتھ پرانے پردے اور ملبوسات تلاش کر رہی تھیں انھوں نے "نائٹ انگیل" ممنوع قرار دیدی۔ اس کے بعد خالہ گرٹ روڈ نے سختی سے اس بات کی مخالفت کی کہ پوکا ہونٹاس انگریزی تاریخ کی ہیروئن تھی۔ ان کے خیال میں وہ خالص امریکی خاتون تھی لیکن اکثریت کی رائے ان کے خلاف تھی۔ پوکا ہونٹاس نے ایک انگریز کی جان بچائی تھی، ایک اور انگریز سے شادی کی تھی، وہ آکر انگلستان میں آباد ہوئی تھی اور اس کی قبر بھی لندن سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ الغرض اسے انگریزی تاریخ کی شخصیت تسلیم کر لیا گیا۔

اگرچہ جینی کی سالگرہ بڑی پر لطف رہی لیکن بڑے بچوں کی سالگرہ کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مثلاً انگلستان میں اکیس سال کے لڑکے لڑکوں کی سالگرہ ایسی ہی ہوتی ہے جیسی امریکا میں گریجویشن پارٹیاں۔ اس موقع پر بہترین ملبوسات، پھولوں، نغموں اور کھانوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

خالہ گرٹ روڈ چاہتی تھیں کہ انگلستان میں عمدہ کھانوں کا انتظام ذرا زیادہ موقعوں پر کیا جاتا تو اچھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوشش کی جائے تو انگریزی کھانے سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے سے وہاں کا بھنا ہوا گوشت مشہور رہے۔ اسی طرح وہاں بعض بحری کیڑوں مکوڑوں سے بھی بڑے لذیذ کھانے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود خالہ گرٹ روڈ کا یہ خیال تھا کہ وہاں کے روزمرہ کھانوں میں تنوع کم ہوتا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی اچھے تیار کیے جائیں۔ انگلستان میں گرم اور سرد یا میٹھے اور نمکین کھانے ساتھ ساتھ کھانا بد مذاقی سمجھا جاتا ہے اس لیے گرم کھانوں میں سلاد شاذ و نادر ہی شامل کی جاتی ہے!

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریز پھیکے کھانوں کو پسند کرتے ہیں۔ اکثریت مسالے استعمال کرتی ہے۔ وہاں کی ہوا چونکہ مرطوب ہوتی ہے۔ اس لیے نمک دانیاں استعمال نہیں کی جاسکتیں۔ نمک ان میں جم کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اپنی پلیٹ میں تھوڑا

سانمک رکھ لیتے ہیں اور لقمہ منہ میں رکھنے سے پہلے اس سے چھوا لیتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت انگریز تین گنا زیادہ نمک کھاتے ہیں لیکن ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے۔ خالہ گرٹ روڈ کو یہ دیکھ کر قدرے افسوس ہؤا کہ انگلستان کے باشندے امریکی طرز کی کوئی تیار نہیں کر سکتے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اہل امریکا انگریزوں جیسی چائے تیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

کھانے کو چھوڑ کر باقی باتوں میں خالہ گرٹ روڈ نے اپنے سابقہ ہم وطنوں میں حقائق و جذبات کا ایک عجیب امتزاج دیکھا مثلاً کسی انگریز کو اس بات میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ وہ اپنے چھوٹے سے پختہ بنگلے کو "ماؤنٹ ایورسیٹ" کہہ کر پکارے کیونکہ وہ پہاڑی مناظر کا دلدادہ ہے۔ وہ اس سے کم سوچتا ہی نہیں۔ یہ محض جذباتیت ہے۔ اس کے علاوہ اسے اس میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کہ شاہ جارج ششم کی سالگرہ جون میں منائے حالانکہ وہ دسمبر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس قسم کے موقعوں کے لیے اچھے موسم کی ضرورت پڑتی ہے اور انگلستان میں دسمبر میں موسم اچھا نہیں ہوتا۔ یہ ہے حقیقت بینی۔ اہل لندن بس کے انتظار میں خاموشی کے ساتھ قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور آرام اور تیز رفتاری سے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے نیویارک کے باشندے ایسے موقعوں پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور بدنظمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ ہے عام سمجھ بوجھ کی بات۔ لیکن گھوڑا گاڑی کے زمانے سے انگلستان میں ایک عجیب رواج چلا آرہا ہے۔ اہل انگلستان بسوں کے راستے اس طرح مقرر کرتے ہیں کہ ایک "پبلک ہاؤس" (سرائے جہاں طعام و قیام کے علاوہ شراب کا انتظام بھی ہوتا ہے) سے دوسرے پبلک ہاؤس تک جانے میں آسانی رہے۔ اجنبی مسافروں کو اس میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ انھیں اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کئی بسوں کے نمبر اور کئی مختلف راستے یاد رکھنے پڑتے ہیں۔

انگلستان کی سرائے معمولی سرائے سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ یہ قومی طرز کا ایک

دار الاقامہ ہوتا ہے جہاں بالغ عمر کے لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ یہاں کلب جیسا تکلف نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگلستان میں کلب نہیں ہوتے حقیقت یہ ہے کہ وہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کی اپنی اپنی علیحدہ جماعتیں ہوتی ہیں جو اپنے اپنے کام میں سرگرم رہتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی جماعتیں مثلاً روٹری کلب، وائی ایم سی اے وائی، ڈبلیو سی اے، عورتوں کے کلب اور سکاؤٹوں وغیرہ کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے، لیکن مقامی "پب" کی کچھ اور بات ہے وہاں شام کو کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، بیئر کا ایک گلاس پیتے ہیں، سیاسیات پر بحث کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی بیویاں بھی ان کے ساتھ آجاتی ہیں اور سب کے سب پیانو کے گرد بیٹھ کر پرانے طرز کا کوئی گیت گاتے ہیں۔

کھانے اور شراب کی فروخت کے علاوہ پب کی اپنی بھی ایک اہمیت ہے جس کا عملی ثبوت دورانِ جنگ میں بار بار ملا۔ حکومت نے ان کے مالکوں کو ہدایت کردی تھی کہ خواہ فروخت کے لیے کوئی چیز موجود ہو یا نہ ہو، پب ہر وقت کھلے رہیں۔ ماضی میں دیہاتی پب ہی ایسی جگہ تھی جہاں سکول کی تعلیم جاری نہ رکھ سکنے والے لوگ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے تھے۔ یہی ایسی جگہ ہے جہاں لوگ اس قسم کے موضوعات پر بحث کرتے ہیں کہ پنجرے میں چڑیا بیٹھی ہو تو پنجرے کا وزن زیادہ ہوتا ہے اور اگر چڑیا بیٹھنے کے بجائے پھڑپھڑا رہی ہو تو وزن کم ہو جاتا ہے۔ پب ہی میں وہ اقتصادیات پر بھی بحث کرتے ہیں۔ یہیں ان کے خیالات میں آزادی اور دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ یہ چیزیں سکول اور کالج میں پڑھ کر یا فلمیں دیکھ کر حاصل نہیں ہوتیں۔

یہ امر مشتبہ ہے کہ انگلستان کے سکول اپنے طلباء میں یہ صفات پیدا کرتے ہیں۔ وہ محض دماغ کی پرورش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے طلباء امریکیوں کی بہ نسبت زیادہ محنت کریں اگرچہ بعض دوسرے یورپین ممالک کے طلباء ان سے بھی زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔

امریکی سکولوں کی طرح وہ فراخدلی، حوصلہ مندی اور احساس ذمّہ داری کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سے کھیلوں کا انتظام کیا جاتا ہے اور سینیر طلبا تنظیم برقرار رکھتے ہیں۔

امریکا کی طرح انگلستان میں بھی تمام بچوں کے لیئے تعلیم لازمی ہے۔ وہاں پرائیویٹ اسکول بھی ہیں جو بہت زیادہ فیس لیتے ہیں (عجیب بات ہے کہ وہ پبلک سکول کہلاتے ہیں) اور سرکاری اسکول بھی ہیں جن میں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ انگلستان کے بہت سے دوسرے بچوں کی طرح ڈینس اور جینی سمتھ گیارہ سال کی عمر تک ایسے ہی اسکول میں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد ان کا امتحان ہوُا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ چودہ سال کی عمر تک اسی سکول میں پڑھیں یا سرکاری وظیفے پر لڑکوں لڑکیوں کے سکولوں میں الگ الگ داخل ہوں۔ اگر وہ وظیفہ حاصل نہ کرتے تو وہ کسی ہائی سکول میں داخل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کے والدین اتنی زیادہ فیس ادا کرنے سے قاصر تھے۔ خوش قسمتی سے انھوں نے یہ امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا اور ہائی سکول میں داخل ہو گئے جہاں ان کے کورس میں وہ کتابیں شامل تھیں جو امریکی یونیورسٹیوں کے پہلے اور دوسرے سال میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اگر جنگ نہ چھڑ جاتی تو ڈینس یونیورسٹی کا وظیفہ حاصل کرنے کے لیے امتحان میں شریک ہوتا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی پرانی یونیورسٹیوں میں بھی نصف سے زیادہ طلبا کو ڈیڑھ سو سے ایک ہزار ڈالر تک سالانہ کے وظائف ملتے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے ڈینس بحریہ میں بھرتی ہو گیا۔ جینی کو یونیورسٹی کی تعلیم کی توقع نہ تھی اس لیے وہ ۱۹۴۲ء میں زنانہ فوج میں شامل ہو گئی۔

اس اثنا میں نینسی اور ٹموتھی کو بھی وظیفے مل گئے۔ نینسی اسی اسکول میں داخل ہو گئی جس میں جینی پڑھی تھی اور ٹموتھی لڑکوں کے ایک مشہور پرائیویٹ سکول میں داخل ہو گیا جو کرائسٹ ہوسپٹل کہلاتا تھا۔ وہاں کے لڑکے لمبے نیلے کوٹ اور زرد اونی موزے پہنتے ہیں۔

مسز سمتھ کے بچّے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بیشتر مواقع فراہم کیے جاتے ہیں اور بہت سے وظائف دیے جاتے ہیں لیکن بعض بچے ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ ان کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ چودہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑ کر کچھ کمانے لگیں۔ اس کے علاوہ بہت سے بچے مقابلے کے امتحان میں کامیاب بھی نہیں ہوتے۔

۱۹۳۷ء میں جب کہ ابھی جنگ کا ہنگامہ برپا نہ ہؤا تھا، خالہ گرٹ روڈ نے دیکھ لیا تھا کہ انگلستان میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ سکول چھوڑنے کی عمر چودہ سال سے بڑھا کر سولہ سال کر دی جائے۔ "پبلک" سکولوں میں داخل ہونے والے غریب بچوں کے لیے زیادہ وظائف کا انتظام کیا جائے اور ایسی ملازمتیں ختم کر دی جائیں جو لڑکوں کو سکول چھوڑ دینے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں جب جنگ شباب پر تھی، پارلیمنٹ نے تعلیم کے متعلق ایک قانون منظور کیا، جس کے مطابق اپریل ۱۹۴۷ء میں سکول چھوڑنے کی عمر پندرہ سال ہو گئی اور جب سکولوں میں زیادہ جگہ، اساتذہ اور کتابوں کا انتظام ہو جائے تو یہ عمر سولہ سال کر دی جائے۔ یہ کام مشکل تھا کیونکہ آنے والے برسوں میں برطانیہ کو اپنے وسائل برآمدی تجارت کے لیے استعمال کرنے پڑے تاکہ ملک دیوالیا ہونے سے بچا رہے۔ پندرہ سالہ بچوں کی نگہداشت بھی آسان نہ تھی، لیکن نئے سکول تعمیر ہو گئے۔ اب تک تو یہ قاعدہ تھا کہ سکول میں صرف اتنے طلبا ہوتے تھے جنھیں ہیڈ ماسٹر فرداً فرداً جانتا تھا۔ اب ان کی تعداد بڑھ گئی اور ایک نیا نظامِ تعلیم وضع کیا گیا۔ امتحان اور انٹرویو کی مدد سے طلباء کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ ہر طالب علم کو اس کے ذوق اور قابلیت کے مطابق ٹیکنیکل یا دوسرے اداروں میں بھیجا جانے لگا۔ لندن اور دوسرے بڑے شہروں میں ہائی سکول تعمیر کیے گئے۔ جہاں کئی ہزار طلباء کو ہر طرح کی تعلیم دی جا سکتی تھی۔ ساتھ ساتھ پرانے اسکولوں کو آہستہ آہستہ جدید خطوط پر ترتیب دیا گیا۔ اور

یونیورسٹیوں میں وظیفہ یافتہ طلباء کی تعلیم کا مزید انتظام کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے خاتمے پر انگلستان میں دوسرے مسائل کے مقابلے میں تعلیم پر زیادہ توجہ کی گئی یہ ملک جانتا تھا کہ اس کی بقا کا انحصار اسی بات پر ہے کہ وہ ویسے شہری پیدا کرے جو موجودہ زندگی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

چھٹا باب

برطانیہ میں زراعت

دورانِ جنگ میں امریکی سپاہی انگلستان کے دیہات میں مقیم تھے وہ، وہاں کے سکولوں میں جاتے اور بچوں سے امریکا کی باتیں کرتے۔ جب ان سے کوئی پوچھتا تھا "امریکی فارم کتنا بڑا ہوتا ہے؟" تو انھیں اس سوال پر قدرے حیرت ہوتی تھی۔ بعد میں انھیں اندازہ ہوا کہ بعض بچے امریکی کھیتوں کو بہت بڑا سمجھتے تھے کیونکہ امریکا ایک بڑا ملک ہے۔ اسی طرح امریکی سپاہیوں کو بھی یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ انگلستان کے بعض فارم کئی ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ یہ ملک چھوٹا ہے اس لیے اس کے فارم بھی چھوٹے ہوں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں ملکوں کے کسان اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کسی بھی فارم کا رقبہ اس کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ آج کل انگلستان کے زیادہ تر فارم ڈیری فارم ہیں اور ان میں سے اکثر کا رقبہ سو ایکڑ ہے۔ نفع کے لحاظ سے بھی وہی فارم اچھے رہتے ہیں جن کا رقبہ سو اور ڈیڑھ سو ایکڑ کے درمیان ہوتا ہے۔ بعض اضلاع میں تقریباً نصف کھیتوں کا رقبہ پچاس ایکڑ سے کم ہے۔

انگلستان میں پچاس ایکڑ والے فارم کا کسان امیر کبیر تو نہیں ہوتا لیکن اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش ضرور رہتا ہے۔ اکثر کسان ان کھیتوں کے مالک نہیں کیونکہ زیادہ تر زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت ہے۔ وہ اسے اپنے مزارعوں یا ان کے ورثا کو ۹۹ سال کے پٹے پر دیدیتے ہیں لیکن فروخت نہیں کرتے۔ اکثر

اوقات ایک ہی خاندان صدیوں سے ایک کھیت جوت رہا ہے۔ جب پرانا پٹا ختم ہو جاتا ہے تو وہ اسے نیا کر لیتا ہے۔ زمین کے بجائے پٹے کی فروخت کے اس سلسلے کی وجہ ہی سے امریکیوں کی بہ نسبت اہلِ انگلستان نے زمین پر حکومت کے قبضے کو ترجیح دی ہے۔ اگر حکومت مناسب قیمت پر زمین خرید لے اور مالکوں کے ساتھ بے انصافی نہ ہو تو مزارع کو زمین کا کرایہ سرکار کو ادا کرنے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس طرح پورے ملک کو فائدہ پہنچے گا نہ کہ صرف ان چند خوش قسمت خاندانوں کو جن کے پاس میلوں لمبا علاقہ ہے لیکن وہ اس کا ایک قطعہ بھی ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنے کو تیار نہیں جو اس پر محنت کرتے ہیں۔

کھیتی باڑی میں زمین کی ملکیت کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا پیداوار کا ہے ہزاروں سال سے پیداوار کا انحصار مٹی اور آب و ہوا پر رہا ہے۔ یونان اور روم کے رہنے والے نیز چوسر کے زمانے کے برطانوی باشندے کھیتی باڑی کے طریقوں کے متعلق تقریباً ایک ہی جیسی ابتدائی معلومات رکھتے تھے۔ ان کے اوزار بڑے بھدے تھے۔ ہل ایسے تھے کہ زمین بس ذرا چھل جاتی تھی اور جب فصل پک جاتی تھی تو اسے پیٹ پیٹ کر اس سے دانے باہر نکالتے تھے۔ زیادہ تر ممالک میں زراعت کا تقریباً ایک جیسا نظام رائج تھا۔ چراگاہیں سب کی یکساں ملکیت ہوتی تھیں اور سب کو ان پر اپنے مویشی چرانے کا حق تھا۔ لیکن ہل چلائی ہوئی زمین پٹوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ہر کسان چند پٹوں کا مالک یا کرایہ دار ہوتا تھا۔ ہر کسان اپنی زمین پر رہتا تھا اور اسے ایک پٹی پر جانے میں کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔

جب تک کھیتی باڑی کا یہ پرانا نظام رائج رہا اس وقت تک ضرورت سے زیادہ غلہ کبھی نہ پیدا ہوا۔ قحط کے زمانے میں بہت سے لوگ بھوک سے مر جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس قدیم نظام کو بدلنا بھی آسان نہ تھا کیونکہ لوگوں کو یہ خوف رہتا تھا کہ اگر

مشترکہ چراگاہوں کو تقسیم کر دیا گیا تو مویشیوں کے لیے گھاس کہاں سے آئے گی اور اگر ادھر ادھر زمین رکھنے کے بجائے ہر کسان کو چند پٹیاں ملا کر تھوڑی زمین ایک جگہ دیدی جائے تو بہت ممکن ہے انھیں پہلی جیسی عمدہ زمین نہ ملے۔ پس بہت سے ملکوں میں ابھی تقریباً سو سال پہلے تک وہی پرانا نظام چلتا رہا۔

انگلستان میں بہت پہلے یہ تبدیلی شروع ہو گئی ـــــــ چودھویں صدی میں ملک کی آبادی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہؤا جو زیادہ تر کسانوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ ضرورت بھر کا غلّہ پیدا کر لیتے تھے لیکن اون اتنی زیادہ حاصل کرتے تھے جو نہ صرف ملکی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھی بلکہ اس کی بہت سی مقدار برآمد بھی کر دی جاتی تھی جب فلانڈرس کے جلاہے ہالینڈ سے مشرقی اینگلیا میں منتقل ہو گئے تو انگریزوں نے ان سے اونی صنعت کے طور طریقے سیکھنے کے علاوہ باغبانی کا فن بھی سیکھا اور اس طرح یہاں ترکاریاں پیدا ہونے لگیں جو جہاز اون لے کر سمندر پار کے ملکوں میں جاتے تھے وہ واپسی پر طرح طرح کی غذائیں اپنے ساتھ لاتے تھے۔ مثلاً امریکا سے آلو آنے شروع ہو گئے۔

اس طرح انگلستان کے کسان نئے خیالات سے متعارف ہوئے اور قدیم راہوں سے ہٹنے لگے۔ انھوں نے خود نئے تجربے شروع کیے اور تمام فصلیں باری باری اس طرح کاشت کرنی شروع کیں کہ زمین اپنی قوتِ نمو کھونے نہ پائے۔ انھوں نے اپنی بھیڑوں کو ہر شب مختلف جگہ بند کرنا شروع کیا تاکہ چراگاہیں اور کھیت ان کی کھاد سے تازہ ہوتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ متحرّک باڑے استعمال کرتے تھے۔ اپنے مویشیوں کو موسم خزاں میں ذبح کرنے یا موسم سرما میں بچی کھچی گھاس پر چھوڑ دینے کے بجائے وہ انھیں اس موسم میں اضافی چارہ دینے لگے۔ نئے اوزار استعمال ہونے لگے اور گھاس خشک کرنے کے نئے طریقے معلوم کیے گئے۔ اسی طرح چارہ محفوظ کرنے

اور زمین کو خشک کرنے کے نئے طریقے معلوم کیے گئے ۔ بہتر غذا ملنے سے جانور اور انسان دونوں زیادہ تندرست ہو گئے ۔ اب کوئی بھی امریکی یا انگریز اس لباس میں نہیں سما سکتا جو قرونِ اوسط کے نواب پہنتے تھے ۔ انگلستان کا غلّہ دوسرے ملکوں میں فروخت ہونے لگا ۔ یہاں کے غریب سے غریب لوگوں نے بھی سرخ رنگ کی وہ سوکھی روٹی کھانی چھوڑ دی جو یورپ کے تمام کسانوں کی غذا تھی ۔ اب وہ بھی گیہوں کی اس سفید روٹی کے عادی ہو گئے جو کسی زمانے میں صرف امراء اور رؤسا کا حصّہ تھی ۔

یہ دو سو سال پہلے کی بات ہے ۔ جب مشینیں ایجاد ہو گئیں اور کارخانے قائم ہوئے تو انگلستان بہت جلد ایک زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل ہو گیا بہت سے کسانوں نے کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا ۔ انگلستان غذا کے معاملے میں خود مکتفی نہ رہا اور اس نے اپنی ضرورت کا گیہوں ریاست ہائے متحدہ امریکا اور کینیڈا سے درآمد کرنا شروع کر دیا ۔ گوشت ارجن ٹائن اور آسٹریلیا سے اور مکھن اور انڈے ڈنمارک ، ناروے اور ہالینڈ سے آنے لگے ۔ بہت سے کسان اب بھی کھیتوں ہی پر رہنے کے خواہش مند تھے لیکن ان کی پیداوار قیمت کے معاملے میں نئے ملکوں خاص طور سے امریکا کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی ۔ جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ملک کی غذائی ضروریات کا دو تہائی حصّہ سمندر پار ملکوں سے آتا تھا ۔

جنگ شروع ہوتے ہی غذائی اشیاء لانے والے بحری جہاز فوجی ضروریات کے لیے استعمال ہونے لگے ۔ کچھ بچے تو وہ دشمن کی آبدوزوں کا شکار ہو گئے اور چند ہفتوں ہی میں انگلستان میں قحط کے آثار نظر آنے لگے ۔ اس وقت کسانوں ہی نے ملک کو بچایا ۔ کسان ، اُن کے بال بچے اور لڑکیاں تک کھیتوں میں کام کرنے لگیں شہروں سے نکل آنے والوں نے بھی یہ کام سیکھا اور کسی حد تک کسانوں کا ہاتھ بٹایا

جو لوگ چھٹیاں گزارنے کی غرض سے دیہات میں آجاتے تھے، انھوں نے گھاس سکھانے اور آلو کھودنے کا کام سنبھالا۔ کسانوں نے طے کر لیا کہ اب وہ پہلے کے مقابلے میں دوگنی غذا پیدا کریں گے۔ اور اگرچہ ان کی تعداد کم تھی تاہم وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

ذیل میں ٹومی ہیسٹن کے چند خطوط نقل کئے جاتے ہیں جو اس نے اپنے چچازاد بھائی جیک کو لکھے تھے اور جن سے آپ کو اس معجزے کا کچھ اندازہ ہوگا۔ ٹومی کے والد کے پاس پچاس ایکڑ زمین ہے اور شروپ شائر میں قریب ہی انھوں نے مزید اسّی ایکڑ زمین پٹے پر لی ہے۔ یہ خوبصورت علاقہ ویلز کے پہاڑوں اور وسطی میدان کے درمیان واقع ہے اور کھیتی باڑی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں ٹومی پندرہ سال کا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ فوجی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے وہ بھی جیک کی طرح ریڈنگ یونیورسٹی میں ایک سال تک ڈیری فارمنگ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرے۔ جیک انگلستان کے جنوب میں ایک طیارہ شکن مرکز سے اور کینز کے مرکز میں منتقل ہو گیا اور وہاں سے شمالی افریقہ چلا گیا لیکن ٹومی کے خطوط برابر آتے رہے جن سے اس کے گھریلو حالات کا علم ہوتا ہے۔

ہوری انڈر ہل
انسلے
سیلپ ۲ر فروری ۱۹۴۱ء
ڈیر جیک :

کیا آپ نے ابھی تک کوئی جے یو ۸۸ مار نہیں گرایا؟ یا حملہ آور آپ سے خوفزدہ ہیں اور انھوں نے آپ سے بچنا شروع کر دیا ہے؟ ایسے میں خرگوش کے

شکار میں بھی کوئی لطف نہ آتا ہوگا۔ ہے نا؟

آپ کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ اب میرا وزن گیارہ سٹون (ایک سٹون ۱۴ پونڈ کے برابر ہوتا ہے) سے زیادہ ہے — پورا گیارہ سٹون پانچ پونڈ۔ امی کو حیرت ہے کہ میں یکایک لڑکے سے پورا مرد کس طرح ہو گیا۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ بھی ہوشیار ہو جائیں اور جب چھٹی پر گھر آئیں تو آپ کو دل کا دورہ نہ پڑے مجھے اس موسم میں چمڑے کی جیکٹ میسر نہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کی جیکٹ شانوں پر کچھ تنگ ہے اس لیے میں وہ جیکٹ پہن رہا ہوں۔ جی چاہے تو میری طرف ایک دو گولیاں چھوڑ دیجیے، میں آپ کی جیکٹ واپس کر دونگا۔ معلوم نہیں گاؤں میں بہت زیادہ پناہ گزین آگئے ہیں یا اب چیزیں کم آنے لگی ہیں۔ کپڑے خریدنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

والد صاحب کو جنگی زرعی اگزیکٹو کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا ہے۔ ان کا سارا وقت میٹنگوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کمیٹی نے تمام کھیتوں کے لئے پیداوار کی مقدار مقرر کر دی ہے۔ ہر شخص اُسے پورا کرنے کے لئے دیوانہ وار کوشش کر رہا ہے چھوٹے کسان امید چھوڑ بیٹھے ہیں لیکن والد صاحب کہتے ہیں کہ یہ لوگ پرانے طریقے نہیں چھوڑنا چاہتے۔ عجب کشمکش کا عالم ہے۔ ایک طرف تو یہ لوگ دودھ کی مقدار میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف زیادہ گیہوں حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے بعض چراگاہوں تک میں ہل چلا دیا ہے۔ اب میں اور بل ہر گائے کا حساب رکھ رہے ہیں کہ وہ کتنا دودھ دیتی ہے۔

خیر طلب

ٹومی

۱۷ر اپریل ۱۹۴۱ء

ڈیر جیک :

کیا آپ جلد ہی چند روز کی رخصت لے کر نہیں آ سکتے؟ انڈرہل میں دو نئے باشندے آگئے ہیں ۔ میری مراد جانوروں سے نہیں اگرچہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے ۔ والد صاحب نے لینڈ آرمی کی دو لڑکیاں بلا لی ہیں، لندن کی اصل کوکنی، خود انھیں معلوم نہیں کہ ان کا کیا فائدہ ہو گا ۔ لیکن چونکہ والد صاحب ڈبلو اے ای سی پر ہیں ۔ اس لیے انھیں اس فارم کو مثالی حیثیت دینی تھی، لہٰذا انھوں نے یہ دو لڑکیاں بلا لیں ۔ وہ تھوڑا بہت کام تو جانتی ہی ہیں ۔ ڈورین دودھ دوہنے میں مہارت رکھتی ہے ۔

والد صاحب سے کہا گیا ہے کہ وہ ہل جوتنے کا تجربہ کریں ۔ انھوں نے ایک کھیت میں دو شاخوں والا ڈبلو اے ای سی کا ایک بڑا ٹریکٹر استعمال کیا ۔ ایک اور کھیت میں انھوں نے تین شاخوں والے ایک ٹریکٹر کا تجربہ کیا اور پھر یہ دیکھا کہ دونوں پر کتنا خرچ آتا ہے ۔ اب تک یہ دیکھا گیا ہے کہ تین شاخوں والے ہل پر وقت اور لاگت دونوں کم خرچ ہوتی ہیں جب یہ تجربہ کامیاب ثابت ہو گا ۔ خاص طور سے پہاڑی کھیتوں پر، تو سب کسانوں سے اسی کو اختیار کرنے کے لئے کہا جائے گا ۔

ہم نے موسم خزاں میں جو گیہوں بویا تھا وہ بڑا اچھا نکل رہا ہے ۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ مارچ میں وہ اتنا اونچا ہو جائے گا کہ اس میں خرگوش چھپ جایا کریں گے ۔ اور واقعی ایسا ہو گا، لیکن خرگوش کو گیہوں کے کھیت میں چھپا یا ہی کیوں جائے؟ کچھ معلوم ہے آپ کو؟

ہاں میں یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ ڈورین بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے ناخن ان لڑکیوں کی طرح سرخ رہا کرتے تھے جن کی تصویریں امریکی رسالوں میں چھپتی ہیں ۔ وہ جنگ سے پہلے بڑا اچھا لباس پہنتی تھی ۔

خیر طلب
ڈومی

۹ر اگست ۱۹۴۱ء

ڈیر جیک :

میرا ارادہ تھا کہ جب سکول موسم گرما کی چھٹیوں میں بند ہوگا تو میں آپ کو خط لکھونگا لیکن ہم سب کھیتی باڑی میں بہت مصروف رہے۔ والد صاحب ڈبلیو اے ای سی کے منصوبوں سے بہت خوش ہیں۔ موسم خراب ہونے کے باوجود ہم نے بہت سی گھاس سکھا کر تیار کر لی ہے۔ جو قطعے پہلے چراگاہ تھے ان پر بھی ہماری امید سے بہتر فصلیں پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے کہ ان میں کھاد اچھی تھی۔ نئی چراگاہیں بھی بہت اچھی ہیں۔ ہماری گائیں ہر روز چار گیلن دودھ دیتی ہیں۔ آجکل کھیتی باڑی پر بہت زور ہے۔ ہر شخص ہل اٹھائے پھرتا ہے۔ کسان یہ سوچ رہے ہیں کہ چراگاہوں کو ہر پانچ سال کے بعد کھیتوں میں تبدیل کرنا چاہیئے یا سات سال کے بعد، ان میں کتنی بار ہل چلایا جائے اور تازہ گھاس اگائی جائے۔

میرے خیال سے میں آپ کو یہ لکھنا بھول گیا کہ ہم نے گاؤں کی کرکٹ گراؤنڈ میں بھی ہل چلا دیا ہے۔

ہاں میں ایک بات کا جواب پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ آپ کے جواب سے بل اور ڈورین کی بحث ختم ہوگئی۔ وہ کہتا ہے کہ اورکینز میں آدھی رات کا سورج نظر آتا ہے۔ لیکن ڈورین انکار کرتی ہے کیونکہ اس کا بھائی اورکینز میں تھا جو سکاٹ لینڈ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ اسکاٹ لینڈ کے شمال میں آدھی رات کا سورج نظر آتا ہوگا۔ کیا آپ اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟

طالب خیر

ٹومی

۱۲ر نومبر ۱۹۴۱ء

ڈیر جیک :

ہم نے گاؤں میں ایک ینگ فارمرز کلب بنایا ہے۔ میں اس کا صدر منتخب ہوا ہوں۔ اس کی تنظیم کے لیے وزارتِ زراعت نے ایک ناظم بھیجا جس نے ہمیں امریکا کے کلبوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ ہم اپنے مویشیوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ کرسمس پر ہم گاؤں کے ہال میں کرسمس پارٹی کا اہتمام کریں گے۔

ہمارے گاؤں کے مشرق کی طرف مسٹر گریگری کی وسیع جائداد ہے۔ انھوں نے والد صاحب سے کہا ہے کہ ان کے خیال میں ایک کسان کے لیے ایک ایکڑ پر ہر سال ایک پونڈ کا نفع ہو جانا کافی ہے۔ والد صاحب کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے ان کے لیے ایک پونڈ فی ایکڑ کا نفع کافی ہو سکتا ہے لیکن جس کسان کے پاس صرف سو پچاس ایکڑ زمین ہے اسے تو اپنے بال بچوں کو پالنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ نفع ہونا چاہیے۔

ینگ فارمرس کا لیڈر کہہ رہا تھا کہ امریکا میں کھلیان کے وقت دو تین ہفتے برابر دھوپ نکلتی رہتی ہے۔ وہاں فصلیں کاٹنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ایک ہم ہیں کہ اگر دو دن بھی مطلع صاف رہے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ فصلیں سنبھالتے ہوئے ہمیں اگست سے نومبر آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم محنت کریں تو ایک دو سال ہی میں ہماری فی ایکڑ پیداوار دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہو جائے گی۔

آپ شاید یہ پڑھ کر ہنس پڑیں گے۔ والد صاحب کھیتوں پر کام کرنے کے لیے لینڈ آرمی کی ایک اور لڑکی بلوانا چاہتے ہیں۔ وہ ڈورین اور میبل کے تعاون کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کے کام سے بہت خوش ہیں۔

امّی پوچھ رہی ہیں کہ کیا آپ کو ان کے بھیجے ہوئے تمام خطوط اور وہ سگریٹ جو ہم ہر ہفتے بھیجتے ہیں، مل گئے ہیں؟ آپ کے پاس افریقہ میں کتنے دن میں خط پہنچتا ہے؟

میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا آپ نے گھاس سکھانے والی مشین کبھی دیکھی ہے؟ یہ مشین جاڑوں کے لیے مویشیوں کے چارے کا بڑا اچھا بندوبست کر دیتی ہے۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ ایسی چند مشینیں چند سال سے استعمال ہو رہی ہیں۔ لیکن وہ اتنی مہنگی ہیں کہ عام کسان انھیں نہیں خرید سکتے۔ ممکن ہے ہم جنگ کے بعد ایگریکلچرل کمیٹیاں قایم رکھیں اور وہ ہمارے لیے مہنگی مشینیں خریدیں جیسا کہ انھوں نے جنگ کے دنوں میں کیا ہے۔ اگر ایسا ہؤا تو تمام کسان یہ مشینیں باری باری استعمال کر سکیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں سب سے زیادہ زرعی مشینیں استعمال ہوتی ہیں. لیکن مجھے اس کا یقین نہیں۔ ممکن ہے جنگ کے بعد ایسا ہو سکے۔ اس وقت ہمارے پاس بہت سی مشینیں آجائیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس اثنا میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں کوئی شخص نلائی کرنے والی ایسی مشین ایجاد کرے گا۔ جو پرانے تمام اوزاروں کو ختم کر دے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ کو شاید یقین نہ آئے مجھے آج رات کو لاطینی کی تیس سطور لکھنی ہیں۔ اب وقت نہیں رہا۔

خیر اندیش

ٹومی

ساتواں باب

انگلستان کی دولت اور وسائل

جاپان کی لڑائی ختم ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ موسمِ خزاں کی ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے کہ مشرقی اینگلیا کے کھیتوں میں سے ایک ٹرین تیزی سے گذر رہی تھی۔ ابھی چند ماہ پہلے اس ٹرین میں امریکی سپاہی بھرے رہتے تھے۔ لیکن آج بہت کم تھے۔ وہ لندن جا رہے تھے۔ بہت سے لڑکے جو اس وقت بحرِ اطلانٹک کے اس پار تھے، ان خالی ڈبوں کو دیکھ کر بڑی حیرت کرتے۔ انھیں وہ دن کبھی فراموش نہیں ہو سکتے جب انھوں نے ان ٹرینوں میں کھڑے سفر کیا ہے اور بلیک آؤٹ میں سیٹیاں بجائی ہیں۔ اگر انگلستان میں یہ گھما گھمی نہ ہوتی تو وہ انگلستان معلوم نہ ہوتا۔

اکتوبر میں یہ گھما گھمی اور بلیک آؤٹ ختم ہو گیا۔ سارجنٹ نے باہر کھیتوں پر نظر ڈالی جن میں کہیں کہیں سنہرے، بھورے درخت کھڑے تھے۔ ان کا رنگ نیو ہیمپ شائر کے میپل درختوں کی طرح کبھی سرخ نہ ہوتا تھا۔ باڑیں ابھی تک سبز تھیں ماسوا ورجینیا کی سرخ بیلوں کے، جو کہیں کہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شام کی دھندلی روشنی میں دور بستیوں کے باغ زرد گلابوں، ایسٹر، ڈہلیا اور گل داؤدی سے بھرے نظر آتے تھے۔ کھڑکیوں سے روشنی کی چمک نظر آ رہی تھی۔

سارجنٹ نے اپنی جیب سے سگریٹوں کی ڈبیا نکالی اور نیلے سوٹ میں ملبوس سامنے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر والے مسافر کو سگریٹ پیش کیا۔

"خدا کا شکر ہے، گھروں میں دوبارہ روشنی تو نظر آئی"۔ اُس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ انگریز نے اپنا اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اسے اس امریکی سے ایک

بار پھر بات کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گذشتہ چند سال کے عرصے میں امریکیوں کے برتاؤ سے پریشان بھی ہوا تھا، خوش بھی اور متاثر بھی۔

"جی ہاں، بالکل" اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ پھر وہ کہنے لگا "معلوم نہیں کون بات بہتر ہے۔ باہر سے روشنیوں کی چمک دیکھنا یا گھروں میں رات کے وقت یہ محسوس کرنا کہ اب اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت نہیں، روشنیاں آزادی سے استعمال کی جا سکتی ہیں۔ آپ بھی تو ان چیزوں کے عادی ہو چکے ہوں گے کتنا عرصہ ہو گیا آپ کو یہاں؟"

"دو سال"

"انگلستان آپ کو پسند ہے؟"

"جی ہاں۔ بہت۔ جی چاہتا ہے اس ملک کو زمانۂ امن میں دیکھوں۔ یہ خوبصورت ملک ہے۔ مجھے یہاں کے باشندوں کے ساتھ رہنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ آپ کی سمجھ میں کیا نہیں آتا؟"

"یہاں کے لوگ بہت سی چیزوں کے بغیر کیسے گزارہ کر لیتے ہیں؟ وہ اتنی تھوڑی مزدوری پر کیسے کام کرتے ہیں۔ وہ پرانے فیشن کے لوگ ہیں۔ ان کے پاس موٹر کاریں بھی نہیں اور اگر ہیں بھی تو بڑی پرانی اور چھوٹی چھوٹی۔ معلوم نہیں۔ اس ملک کے لوگ جدید طرز کی بڑی بڑی چیزیں تیار کیوں نہیں کرتے!"

انگریز ہنس پڑا۔

"ٹھیک ہے سارجنٹ، آپ نے چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا اور ہم میں سے بہت سے لوگوں کو آپ سے اتفاق بھی ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ٹیلیفون، ریفریجریٹر، کار اور دوسری آرام دہ چیزوں کے بغیر گذارہ

کر لیتے ہیں جو آپ امریکیوں کے پاس ہوتی ہیں۔ یورپ میں ہمارا معیارِ زندگی سب سے اونچا ہے۔ لیکن آپ کے مقابلے میں پست ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کے اسباب پر غور کیا ہے ؟"

"میرے خیال میں لوگ چاہتے نہیں کہ ــــ" سارجنٹ نے کہنا شروع کیا۔

"غلط" انگریز نے کہا "ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہمارے پاس بھی آپ جیسی بڑی بڑی کاریں ہوں۔ اگر ریفریجریٹر اور کپڑا دھونے کی مشینیں اتنی سستی ہو جائیں کہ ہر شخص انھیں خرید سکے تو ہم بھی ان کے عادی ہو جائیں گے۔ ابھی تک وہ خاصی مہنگی ہیں۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں خرید و فروخت محدود ہے۔ یہ بات درست ہے۔ ممکن ہے وہ ایک حد تک بری بھی ہو لیکن معیارِ زندگی کا فرق لوگوں کی طبیعتوں کے فرق کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے قومی وسائل کا خیال بھی تو کیجیے کہ وہ آپ سے کس درجہ مختلف ہیں"

" امریکا میں ضرورت کی تقریباً تمام معدنیات موجود ہیں۔ تیل کی افراط ہے اور لکڑی کی بھی کمی نہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ ہم نے اپنے وسائل کو بڑی حد تک ضائع بھی کیا ہے"

"خیر اس کا تو مجھے علم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جہاں تک خام مال کا تعلق ہے آپ کا ملک دنیا کے نہایت دولت مند ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا آپ کے ملک میں لوہا، چاندی، تانبا، رانگ، کوئلا، تیل اور غذائی اشیا کی افراط ہے۔ آپ کے ملک میں ایک میل میں اوسطاً چالیس افراد آباد ہیں۔ ہمارے وسائل بھی کم ہیں اور ہمارے ہاں ایک میل میں تقریباً سات سو افراد آباد ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ملک میں رہنے والے ہمارے مقابلے میں زیادہ امیر ہونگے۔ ہمارے ہاں کوئلا بہت ہے خاص طور سے شمالی اور جنوبی ویلز میں۔ کوئلے اور لوہے کے ذخائر سمندر

کے قریب واقع ہیں ۔ انھیں باہر بھیجنا بھی مشکل نہیں لیکن کوئلا ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس کافی مقدار میں موجود ہے ۔ بڑی احتیاط اور بار بار کی شجر کاری کے بعد ہمیں اپنے جنگلوں سے کچھ لکڑی بھی مل جاتی ہے لیکن ذرا سوچیئے تو سہی کہ ہم ان جنگلوں کو گذشتہ دو سال سے استعمال کر رہے ہیں ۔ اب جتنی لکڑی حاصل ہوتی ہے ۔ وہ صرف ہمارے فرنیچر اور اوزاروں کے لیے کافی ہوتی ہے ۔ کاغذ سازی کے لیے لکڑی کا گودا باہر سے آتا ہے ۔ کوئلے کے علاوہ دوسری معدنیات بھی ہمارے پاس تھوڑی مقدار میں موجود ہیں لیکن چینی مٹی کافی ہے ۔ ہماری آبادی کا صرف چھ فیصد حصّہ کسانوں پر مشتمل ہے ۔ اس لحاظ سے ہماری زمین کافی زرخیز ہے ۔ ہمارے ہاں کی اُون اب بھی دنیا بھر میں بہترین سمجھی جاتی ہے ۔ آپ نے وہ بڑی بڑی اونی شالیں تو دیکھی ہونگی جو ہلکی بھی ہوتی ہیں اور گرم بھی اور اتنی نفیس کہ انگوٹھی میں سے گزر سکتی ہیں ۔ بس اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک ایکڑ میں تقریباً چالیس بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے ۔ غالباً مستقبل میں اس مقدار میں اضافہ ہو جائے گا ۔ لیکن میرے خیال میں ہم غذا کے معاملے میں کبھی خود مکتفی نہیں ہو سکتے ۔ ہمارے ہاں مکھن ، پنیر ، گوشت اور روٹی کی کمی رہے گی ، پھلوں کا تو ذکر ہی کیا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں مچھلی کی کمی نہیں اور اس سے ہمیں خاصی مدد ملتی ہے لیکن ہمارے یہ وسائل ہماری پوری آبادی پر تقسیم ہو جاتے ہیں ساڑھے سات سو افراد فی مربع میل !"

"اوہ" ۔ سارجنٹ نے کہا " اس بات پر تو میں نے غور ہی نہ کیا تھا ۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ لوگ سست اور پرانے فیشن کے ہیں اسی لیے آپ کے پاس ہماری طرح نئی چیزیں نہیں ۔ اب مجھے حیرت ہے کہ اتنی مشکلات کے باوجود آپ کا طرزِ زندگی اتنا اچھا ہے ۔ آپ کے وسائل ہمارے مقابلے میں کم ہیں پھر بھی آپ کی حالت خراب

نہیں۔ آپ کے ملک میں کوئی شخص بھی ایسی جھونپڑیوں میں رہتا نظر نہیں آتا جیسے ہمارے ملک کے باشندے بھی کچھ عرصہ پہلے رہتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی گنجان آبادی کے باوجود آپ لوگ اتنی اچھی طرح کیسے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو اپنی نوآبادیوں کینیڈا اور ہندوستان وغیرہ سے کچھ دولت مل جاتی ہے؟"

"سارجنٹ! سنبھل کر!! کینیڈا کا کوئی باشندہ یہ نہ سن لے کہ اس کا ملک ہماری نوآبادی ہے۔" انگریز نے مسکراتے ہوئے کہا "کینیڈا ایک خود مختار مملکت ہے اگرچہ ہندوستان کے معاملات میں ہمیں کچھ دخل ضرور ہے لیکن ہمیں وہاں سے ٹیکسوں کی شکل میں کچھ نہیں ملتا۔ ہماری حکومت کو باہر سے کسی قسم کی آمدنی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ہوتی ہے تو بیرونی تجارت سے۔ غیر ملکی تجارت ہماری بقاء کے لیے ضروری ہے۔"

سارجنٹ آگے کی طرف جھک گیا۔

"وہی بیرونی تجارت والی بات جو میں اکثر سنتا رہتا ہوں۔ ممکن ہے میں گونگا ہوں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ خرید و فروخت کا معاملہ ہے، اتنا تو میں سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ اتنی زیادہ چیزیں کیوں خریدتے ہیں — کچھ غذائی چیزیں، تیل، ضرورت کی بہت سی لکڑی، لوہا، ایلومینیم اور سونا وغیرہ۔ آپ بیچتے کیا ہیں؟ آپ کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں سوائے تھوڑے کوئلے اور اون کے۔"

"ہمارا کام۔" انگریز نے کہا۔

"کام سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہی۔" انگریز نے کہا "ہمارے اس چھوٹے سے جزیرے میں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ وہی ہماری دولت ہیں۔ جتنے زیادہ لوگ ہیں اتنے ہی دماغ ہمارے

پاس ہیں، اتنی ہی ہنرمندی، اتنی ہی زیادہ تکنیکی مہارت، تجربہ اور جسمانی قوت۔ ہم کچا لوہا ہی درآمد کرتے ہیں۔ ہمارے لوگ اپنی ہنرمندی اور تجربے سے اس پر محنت کرتے ہیں اور اس سے عمدہ اوزار تیار کرتے ہیں۔ تیار شدہ مال کی قیمت درآمدشدہ خام مال سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ ہمارے کام آتا ہے۔ اب سمجھے آپ؟"

"ٹھیک ہے" سارجینٹ نے کہا "لیکن ہم اور دوسرے ممالک بھی یہی کرنا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی؟ آپ ساری دنیا سے خام مال درآمد کر کے ہمارے ساتھ کس طرح مقابلہ کریں گے؟ آپ کے مال کی قیمت زیادہ ہو گی؟"

"ممکن ہے ایسا ہو لیکن ہماری چیزیں سمندر پار کے ملکوں تک پہنچ کر بھی اسی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں جیسے آپ کی چیزیں خود آپ کے اپنے ملک میں۔ اگر ہماری چیزیں دوسرے ملکوں کی مصنوعات سے کچھ مہنگی بھی ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ بہتر ہوتی ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارا مال ہمیشہ بہتر رہے گا۔ ہمارے ملک کے لوگ بڑے اچھے کاریگر ہیں۔ وہ اپنی دستکاری کے لیے مشینوں کی ایجاد سے پہلے سے مشہور ہیں۔ ہمارے اندر ایجاد کا مادہ موجود ہے۔ جنگ سے پہلے ہم ٹیلی وژن میں سب سے آگے تھے اور جنگ کے زمانے میں ہم نے ریڈار، بیلی پل، ملبری ہاربر اور جیٹ جیسی ایجادات پیش کیں۔ آپ تو اس فہرست سے واقف ہی ہوں گے۔ میں امریکیوں کی جدت طرازی اور دستی مہارت کا بڑا مداح ہوں۔ لیکن قابلیت صرف آپ کی میراث نہیں۔

"میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ مقابلہ سخت ہے۔ ہم بھی عمدہ قسم کا مال تیار کرتے ہیں۔ ہم آپ کا مال نہیں خریدیں گے۔ ہمیں بھی اپنے آدمیوں کے لیے

روزگار فراہم کرنا ہے۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ وطن واپس ہو کر مجھے کوئی کام ملے گا۔ یا نہیں۔ اور لوگ مجھ سے آگے پہنچ چکے ہوں گے۔ ہمیں بھی مال فروخت کرنا ہے خریدنا نہیں۔"

"درست ہے۔" انگریز نے کہا۔ "یونہی سہی۔ اگر آپ ہمارا مال نہیں خریدینگے تو ہم بھی آپ کا نہیں خریدیں گے۔ آپ کے لیے ہمارے پونڈ کاغذ کے پرزوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم آپ کے مال کی قیمت ڈالروں میں اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے جب تک آپ ہمارا مال خرید کر ہمیں ڈالر نہ دیں۔ یعنی جب تک آپ ہمارا مال نہ خریدیں، ہم آپ کا مال نہیں خرید سکتے۔ تجارت صرف ایک طرف سے نہیں ہوتی بلکہ دو، چار، دس، بیس طرف سے ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سارجنٹ بولا۔ "اسے چھوڑیے۔ میں اس بات پر بعد میں غور کرونگا۔ آیے اُسی موضوع پر واپس چلیں جس سے ہم نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ آپ پرانے طرز کے لوگ ہیں اور آپ نے میرے اس خیال کی تردید نہیں کی۔"

"سارجنٹ!" انگریز نے کہا۔ "میں تردید کی کوشش نہ کروں گا۔ "ہم مشینوں کارخانوں اور گھروں کے ساز و سامان کے معاملے میں اکثر قدامت پسندی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہم بعض اوقات تبدیلی کو پسند نہیں کرتے لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہوتی ہے۔"

"قدامت پسندی کا کوئی جواز میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔"

"کسی چیز کا بدل تلاش کیے بغیر اسے پھینک دینا محض حماقت ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ چونکہ ہمارے وسائل محدود ہیں اس لیے ہم آپ امریکیوں کی طرح چیزوں کو ضائع نہیں کر سکتے۔ ہماری قدامت پسندی کی وجہ معلوم

کرنے سے پہلے آپ کو ہماری تاریخ سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے انگلستان کو ساری دنیا کا کارخانہ کہا جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم موجودہ صنعتی نظام ایجاد نہ کرتے تو کوئی دوسرا ملک جلد یا بدیر ایسا کرتا لیکن اس ایجاد کا سہرا ہمارے سر ہے۔ ہم دوسروں سے آگے رہے اور جلد امیر بن گئے۔ لیکن ہم نے اپنی کامیابی کی اچھی قیمت ادا کی ہے۔ فرض کیجیے میرے پردادا نے دنیا کی سب سے پہلی پائپ فیکٹری قائم کی تھی۔ انھوں نے مشینری تیار کی، تعمیر کا منصوبہ تیار کیا۔ اور اپنے کاریگروں سے کام لیا۔ رقم بہت خرچ ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہترین سازوسامان لگایا اور جب کارخانہ تیار ہو گیا تو اس میں بہترین پائپ اور ٹیوب تیار ہونے لگے اور سارے انگلستان میں فروخت ہونے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی اصلاحات بھی ان کی سمجھ میں آئیں لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے پر بہت زیادہ خرچ آتا اس لیے وہ پرانے طریقے ہی پر کام کرتے رہے۔ دس سال بعد اُن کا ایک کاریگر امریکا چلا گیا اور اس نے نیویارک میں ایسی ہی ایک پائپ فیکٹری شروع کر دی اور اس میں وہ اصلاحات بھی شامل کر لیں۔ جو میرے پردادا نہیں کر سکے تھے۔ تجربے کے بعد خود اس کی سمجھ میں کچھ اور اصلاحات آئیں جب اس کے کاروبار نے ترقی کی تو اس نے ایک اور نہایت نفیس کارخانہ قایم کر ڈالا۔ کچھ عرصہ بعد کیلی فورنیا میں ایک اور فرم نے یہ کام شروع کر دیا۔ اُس کا پلانٹ کم قیمت پر مال فراہم کرنے لگا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس امریکی نے اپنے دونوں کارخانوں کو جدید شکل دی۔ ایک ترقی پذیر ملک میں نفع یقینی تھا۔" سارجنٹ نے سر ہلایا۔

"اور اس اثنا میں آپ کے پردادا اپنا پرانا کارخانہ اسی پرانے طریق پہ چلاتے رہے۔"

"بالکل۔ انھیں اپنے خرچ پر نظر رکھنی پڑی کیونکہ ان کے مال کی نکاسی اتنی نہ تھی جتنی آپ امریکیوں کے مال کی ہوتی ہے، لہٰذا ان کا پلانٹ پرانا ہوتا گیا اور آخر میں اُن

کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اُسے کس طرح جدید سانچے میں ڈھالیں۔ ہماری کوئلے کی صنعت اور سوتی کارخانوں کا یہی حال ہوا۔ ہمارے پاس جدید پلانٹ بھی ہیں اور دورانِ جنگ میں بھی ہماری پیداوار میں پندرہ فیصدی کا اضافہ ہو گیا تھا —— جو آپ کے مقابلے میں زیادہ نہیں لیکن ہمیں ہوائی حملوں اور بلیک آؤٹ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ہمیں اپنے یہ پلانٹ وسیع علاقے میں پھیلانے پڑے۔ اس کے علاوہ ہماری رسد بھی بہت کم ہو گئی تھی۔"

"لہٰذا آپ ابھی تک چھوٹی گاڑیاں اور کاریں اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ آپ اُن کارخانوں کو جدید طرز پر نہیں لا سکے جن میں وہ بنتی ہیں؟"

"نہیں سارجنٹ، اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ ہمارے ہاں ہر چیز پرانی اور ناکارہ نہیں۔ اس ملک میں رسل و رسائل کے لیے چھوٹی گاڑیاں استعمال کرنے میں فائدہ رہتا ہے۔ اگر ہم بڑی گاڑیاں استعمال کریں تو یا تو وہ آدھی خالی رہیں گی یا اگر ہم انھیں بھر کر لے جائیں گے تو مختلف مقامات پر سامان اتارنے کے لیے ہمیں بڑے چکر سے جانا پڑے گا۔ چھوٹی گاڑی کو پورا بھرا جا سکتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ براہِ راست بھیجا جا سکتا ہے۔ اس طرح کفایت رہتی ہے۔ کاروں کے معاملے میں بھی ہماری ضروریات آپ سے مختلف ہیں۔ ہمیں ایسی کاریں درکار نہیں جو آپ کے کوہِ راکیز یا وسیع ریگستان میں دو ہزار میل لمبا سفر طے کریں۔ ہم شاذ و نادر ہی دو تین سو میل سے زیادہ سفر کرتے ہیں۔ ہمیں تیل اور پٹرول درآمد کرنا پڑتا ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کار ایک گیلن میں زیادہ سے زیادہ میل طے کرے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کی ضروریات ہم سے مختلف ہیں، لیکن آپ کے ہاں مزدوری کیوں کم ہے۔ کیا کاروبار کی کمی کی وجہ سے؟"

"ایک حد تک یہ وجہ بھی ہے، لیکن کچھ وجوہ اور بھی ہیں مثلاً بعض کارخانوں میں پرانی مشینیں ہیں جو پیداوار میں آپ کے جدید پلانٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں کی

آب و ہوا (خاص طور سے دھوپ کی کمی) ایسی ہے کہ کوئی شخص بھی بہت زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ ہماری مزدوری کم ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آپ کے مقابلے میں کم ٹیکس دیتے ہیں۔ آپ کے ملک کی بہ نسبت ہمارے ہاں حکومت نے ہمیں بہت سی سہولتیں دے رکھی ہیں۔"

"اچھا اب آپ سیاسیات پر آ گئے جناب۔ یہ خود ایک بہت بڑا موضوع ہے۔۔ لندن قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر آج بحث نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ میری خواہش تھی کہ میں اس ملک کی سیاست پر روشنی ڈالوں۔ مجھے انگلستان میں دو سال ہو گئے ہیں پھر بھی میری سمجھ میں یہاں کے بادشاہ کا مقام نہیں آتا۔ نہ میں پارلیمنٹ اور دوسری چیزوں کا مقصد سمجھ سکا ہوں۔"

"آپ نے اس ملک کی تاریخ پڑھی ہے؟"

"زیادہ نہیں۔"

"اچھا۔" انگریز نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا چونکہ اب لندن کا اسٹیشن قریب آ گیا تھا "مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے آپ کی امریکی تاریخ سے بہت کم واقفیت ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ میں اس موضوع پر کوئی کتاب لے کر آپ کے عوام کے متعلق معلومات حاصل کروں بشرطیکہ آپ بھی ہماری تاریخ کا مطالعہ کریں اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انگلستان میں جو کچھ آج ہو رہا ہے، وہ صدیوں پرانے واقعات و روایات ہی کا ایک سلسلہ ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ملک کا پس منظر سمجھ جائیں تو ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میں اس پر غور کروں گا جناب۔" سارجنٹ نے کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی

خوشی ہوئی۔"

"شکریہ سارجنٹ۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔"

سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا "خدا حافظ"۔

آٹھواں باب :

انگلستان موجودہ حالت پر کس طرح آیا؟

۲۵۰۰ قبل مسیح تا ۱۰۶۶ء

انگریز لڑکوں لڑکیوں کو اپنے ملک کی تاریخ پڑھنے میں اس وجہ سے دقّت ہوتی ہے کہ وہ بہت لمبی ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکی تاریخ کا مطالعہ بہت سادہ ہے کیونکہ وہ صرف جنگِ آزادی، وسطی اور مغربی حصّہ ملک کی آبادکاری اور خانہ جنگی پر مشتمل ہے۔ انگلستان کے سکول ماسٹروں کو تمام بادشاہوں کے حالات پڑھانے پڑتے ہیں، آرتھر (جو سکیسنوں سے لڑا تھا) اور ایلفریڈ (جو ڈین سے لڑا تھا) سے لے کر شاہِ جارج ششم تک جن کی فوجیں نازیوں سے برسرِ پیکار ہوئی تھیں۔ اس کے برخلاف امریکی بچوں کو موسمِ گرما میں اگست کی چھٹیوں سے پہلے امریکا کے تینتیس ۳۳ صدروں کے نام یاد کرنے اور اس ملک کی مختصر تاریخ پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

انگلستان کے طلباء کو نئے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں ایک آسانی ضرور ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف اپنی تاریخ کے نشان پھیلے ہوئے دیکھ سکتے ہیں امریکا جیسے نئے ملک میں بھی یہ نشانات ملتے ہیں لیکن لوگ انھیں پہچانتے نہیں مثلاً امریکا میں بھی ایک پونڈ سیب اسی طرح لکھا جاتا ہے، جس طرح انگلستان میں۔ لیکن کون جانتا ہے کہ پونڈ کا یہ نشان اصل میں لاطینی ہے اور اس زمانے کی یادگار ہے جب پڑھے لکھے لوگ صرف

لاطینی زبان میں لکھتے پڑھتے تھے۔ ہم راہبہ (نن) کے جسم پر جو لباس دیکھتے ہیں۔۔ وہ دراصل قرونِ اوسط میں استعمال ہوتا تھا۔ قدیم گرجا گھروں میں مشینوں اور عجائب گھروں میں ماضی کے کتنے ہی نقوش اب بھی موجود ہیں۔ لیکن ہم انھیں پہچانتے نہیں کیونکہ ہم ان سے بہت دور نکل آئے ہیں۔

اس کے برعکس انگلستان میں ماضی سے فرار ممکن نہیں، بالکل اسی طرح جیسے آپ سمندر سے بہت دور نہیں جا سکتے۔ واقعاتی اور روایتی ہیروؤں کے قدموں کے نشانات ہر گذرگاہ پر ملتے ہیں۔ ہر گاؤں کسی نہ کسی بادشاہ سے آشنا ہے۔ ہر گرجا گھر کے صحن میں کوئی نہ کوئی بڑا آدمی دفن ہے۔ ۱۹۴۰ء تک انگلستان لڑائیوں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اب بھی دیہاتی علاقوں میں عوام کے "جھونپڑے" اور اکابر کے محلات صدیوں سے اسی طرح کھڑے ہیں۔ گرجا گھروں میں معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن بارھویں صدی سے بیسویں صدی تک مذہبی رہنماؤں کی پوری فہرست موجود ہے۔ پرانے نقشوں پر انگلستان کے غیر اہم دیہات تک کے نام موجود ہیں اگرچہ ان کے ہجّے ذرا عجیب سے ہیں۔ یہ نقشے ان لوگوں کے لیے تیار کیے گئے تھے جو اب سے چھ سو سال پہلے مسیحی جہاد کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مسولا، مونٹانا کے ہائی اسکول (قائم شدہ ۱۸۶۱ء) کے طلبا نے اخبار کے تراشوں سے ایک کتاب تیار کی جو ان کے وطن سے متعلق تھی۔ اس کے بدلے انھیں انگلے، یارک شائر کے سکول سے ایک کتاب موصول ہوئی۔ اس میں ایک مضمون تھا جسے دیکھ کر یہ طلبا بڑے خوش ہوئے۔ اس میں لکھا تھا "انگلے کی جدید تاریخ ۶۰۰ء میں شروع ہوئی" لیکن یہ جملہ وہاں کے طلبا و طالبات نے دانستہ طور پر لکھا تھا۔ وہ اس زمانے کے لوگوں سے وہی قُرب محسوس کرتے تھے جو آج ہم اپنے شہروں کو بنیاد رکھنے والوں سے محسوس کرتے ہیں۔ ۶۰۰ء سے اب تک کا عرصہ ان کے ذہن میں اس طرح موجود ہے جیسے ان میں خود ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

اس کے باوجود انگلستان میں بھی جدید تاریخ کا آغاز ۶۰۰ء سے نہیں کیا جاتا۔ بہت سی کتابوں میں ۱۴۸۵ء کو قرونِ اوسط اور عہد جدید کے درمیان حدِّ فاصل قرار دیا

گیا ہے اگرچہ اس سے پہلے کا زمانہ بھی نہایت درخشندہ ہے۔ انگلستان کی ابتدائی تاریخ کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں۔ اس کے متعلق ہم نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہیں وہ ان ہتھیاروں، اوزاروں اور برتنوں وغیرہ سے ملی ہیں جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کچے قلعوں کے قریب کھدائی کر کے نکالے ہیں۔ قدیم ترین انسان کا ڈھانچا پلٹ ڈاؤن سے کھود کر نکالا گیا تھا۔ بہت سے نشانات سے پتا چلتا ہے کہ انگلستان پتھر کے زمانے سے چلا آتا ہے اس زمانے میں جزائرِ برطانیہ براعظم یورپ سے ملے ہوئے تھے۔ خطۂ روم کے لوگ بھی مغرب تک پہنچتے تھے۔ جنوبی مغربی انگلستان کے کسانوں کو اکثر اپنے آباؤ اجداد کا خیال آتا ہوگا کیونکہ ہل چلاتے وقت انھیں گرینائٹ کی ایک ٹوٹی پھوٹی چٹان یا دو تین چٹانوں کے مجموعوں کے چاروں طرف گھومنا پڑتا ہے جن کی بلندی دس پندرہ فٹ ہے۔ یہ پتھر تقریباً چار ہزار سال پہلے یہاں رکھے گئے تھے اور ان قدیم لوگوں کے مذہبی ارکان کا جزو تھے جو برائتھن کہلاتے تھے اور جن کے نام سے ان جزائر کا نام برٹن پڑا۔ ان لوگوں کے مذہبی صدر مقام کا نام "سٹون ہنج" تھا جہاں اب بھی گرینائٹ کی سلوں کا ایک عظیم حلقہ ان کے تقدّس اور انجینیری کی مہارت کی یاد دلاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سیاہ فام پست قد لوگوں نے یہ وسیوں ٹن وزنی سلیں کس طرح میلوں تک کھینچ کر یہاں پہنچائیں اور پھر انھیں اٹھا کر اتنی اونچائی پر رکھا۔

صدیاں گزر جانے کے بعد برطانیہ کے یہ قبیلے کھیتی باڑی سیکھ گئے۔ انھوں نے کانوں سے رانگ نکالنا شروع کر دیا۔ ان کی شادیاں ہوئیں، بچے پیدا ہوئے اور پھر ان چھوٹے چھوٹے دیہات میں مرکھپ گئے۔ جو آج بھی نشیبی اور کوہستانی علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ۵۵ قبل مسیح میں جولیس سیزر اور اس کے رومن سپاہیوں نے رودبارِ انگلستان کو پار کر کے فرانس کی طرف سے اس جزیرے پر حملہ کیا۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۵ء کو جب کہ دنیا نہایت بےچینی کے ساتھ جاپانیوں کے ہتھیار ڈال دینے اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے

کی منتظر تھی، بی بی سی لندن سے بچوں کے ایک گھنٹے کے پروگرام کے بجائے اس قدیم حملے کی دو ہزارویں سالگرہ نشر ہوئی جس نے ہمیشہ کے لیے انگلستان کا نقشہ بدل ڈالا اور انگریزی بولنے والوں کی زبان اور ثقافت پر نمایاں اثر ڈالا۔ جون ۱۹۴۴ء میں رودبار انگلستان کے اس پار مخالف سمت میں جانے والے ہزاروں سپاہیوں نے اپنے اسکول کے زمانے میں سیزر کے حملے کا حال پڑھا ہوگا لیکن انھیں ان رومن فوجوں کا خیال نہ آیا ہوگا جو اپنے بجروں میں بیٹھ کر اس ملک پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ جب افواج متحدہ نے تیز ہواؤں سے اپنے ہاربر کو تہ و بالا ہوتے دیکھا ہوگا تو انھیں شاید ہی اُس طوفان کا خیال آیا ہو جس نے سیزر کے بیڑے کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اسے مراجعت پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے باوجود رومن حملہ آور اور اقوام متحدہ کی فوجیں ان طوفان خیز موجوں پر چڑھ گئے محض اس وجہ سے کہ دریائے رائن کے مغرب میں کوئی بھی وہ قوت یورپ پر قابض نہیں ہو سکتی جس نے برطانیہ اور رودبار انگلستان کو تسخیر نہ کر لیا ہو۔

سیزر کا دوسرا حملہ پہلے سے زیادہ کامیاب تھا کیونکہ اس نے برطانوی سردار کیسی ولانس کو شکست دیدی تھی قبل اس کے کہ وہ اپنی فوج "گول" واپس لے جائے۔ رومن فوجیں ۴۳ء تک یعنی آیندہ نوے سال تک واپس نہیں آئیں اور آئیں تو ایسی ٹھہریں کہ آئندہ چار سو سال تک تقریباً تمام انگلستان پر رومیوں کا قبضہ رہا۔ شہروں اور اہم مقامات کے درمیان سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا تاکہ بغاوت کے وقت فوجیں ادھر سے ادھر بھیجی جا سکیں۔ یہ سڑکیں تھیں تو تنگ لیکن ان پر پتھر کی سلیں کچھ اس طرح بچھائی گئی تھیں کہ دو ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنی جگہ مستحکم ہیں۔ راستے میں جہاں کہیں پہاڑ یا دلدلیں آئی ہیں وہاں بھی ان سڑکوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ لنڈینیم سے کیمل ڈنم تک جو بعد میں کولچسٹر ہو گیا لنڈینیم سے شمال میں ایبورکم دیارک اکے اور

اُس سے آگے اُس دیوار تک جو ہارڈین نے بنوائی تھی، لنڈینیم سے یوریکونیم (شروس بری) تک اور پھر مانکونیم (مانچسٹر) تک، لنڈینیم سے ڈرنو ویریا تک جو بعد میں ڈورچسٹر ہو گیا اور ریگنم تک جو پورٹس ماؤتھ بن گیا اور مشرق میں ڈبرائی یا ڈوور تک یہ سڑکیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑکوں کا یہ جال لندن سے شروع ہوتا تھا۔ اِسی لیے رومنوں نے لندن کو انگلستان کا دار الحکومت بنایا۔

اوپر شمال میں ہارڈین دیوار ۱۲۳ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اینٹونینس کی دیوار ۱۴۰ء میں بنی تھی۔ انھوں نے اسکاٹ لینڈ کے نیم وحشی باشندوں کو روکے رکھا۔ ویلز اور کارنوال کے باشندے اپنے قدیمی رسم و رواج پر قائم رہے، انھوں نے اٹلی کے اثر کو رد کیا لیکن دوسرے اضلاع میں رومنوں نے مشتری، مریخ اور منروا کے مندر تعمیر کرائے جنھیں عیسائیوں نے بعد میں گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا۔ مثلاً لندن کا سینٹ پال۔ دیہاتی اضلاع میں رومن محل تعمیر ہو گئے جن کے فرش پھول دار ہوتے تھے اور جن میں داخل ہونے کے لیے سیڑھیاں ہوتی تھیں رومنوں نے گرم ہوا کے لیے بھٹیاں اور عمدہ غسل خانے بنوائے۔ جن میں انھیں بڑا آرام ملتا تھا اتنا آرام بیسویں صدی کے عام برطانوی گھروں میں بھی میسر نہ ہو گا۔ کھلے میدانوں میں اس زمانے کے برطانوی باشندے رومنوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے کھیل دیکھتے تھے۔ رومن سپاہیوں نے مقامی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور جن سپاہیوں نے پانچویں صدی میں برطانیہ پر قبضہ جمائے رکھا وہ زیادہ تر مقامی طور پر بھرتی کیے گئے تھے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ جب روم عیسائیت کا پیرو ہو گیا تو برطانیہ نے بھی مذہب تبدیل کر لیا۔ بعد میں شمالی اور مشرقی حملہ آوروں نے ابتدائی گرجا گھروں کے نقوش برطانیہ میں تو مٹا دیے لیکن آئرلینڈ اور مغربی جزائر میں اعتقاد کی شمع بدستور روشن رہی تا آنکہ مشنریوں کی ایک اور جماعت نے اینگلو سیکسن، انگلستان کے لامذہب لوگوں کو، مذہب کی راہ دکھائی۔
روم کی حکومت یکایک ختم ہو گئی۔ خود اس شہر پر شمال کی طرف سے گوتھوں نے حملہ

کردیا۔ سارے یورپ میں بےچینی پھیل گئی۔ روم نے جنوبی مشرقی انگلستان کے ساحل یعنی "ساحلِ سیکسن" کی حفاظت کے لیئے جو فوج بھیجی تھی اسے دار الحکومت کو بچانے کے لئے واپس بلا لیا۔ ۴۲۶ء جیسے قدیم دور میں رومن برطانیہ امداد کے لیے چلاّ رہا تھا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ طوفان پھٹ پڑا۔ آئرلینڈ کے کلٹیوں نے مغرب کی طرف سے انگلستان پر حملہ کر دیا۔ سکاٹ لینڈ کے وحشی شمال سے حملہ آور ہوئے اور مشرق سے جرمنی کے سیکسنوں نے حملہ کر دیا۔ کارنوال کے بہت سے باشندے رود بارِ انگلستان پار کرکے فرانس کے اس حصّے میں قیام پذیر ہو گئے جواب برٹینی کہلاتا ہے۔ کچھ لوگ پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور اپنے گھر سیکسنوں کے حوالے کر دیے۔ بہت سے سیکسنوں نے لڑائی بند کر دی اور اپنی پسند کی زمینوں پر زراعت کرنے لگے۔

یہ تبدیلی کا دور تھا لیکن ایک جگہ کی تبدیلی کا پچاس میل دور کے مقام پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ عیسائی مشنریاں ویلز میں خانقاہیں تعمیر کر رہی تھیں۔ دوسری طرف کورنش بادشاہ آرتھر اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ سیکسن حملہ آوروں سے آخری جنگ لڑ رہا تھا۔ اس بادشاہ کے متعلق اِس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ وہ اس قدر بہادر اور محبوب رہنما تھا کہ جب آخر کار وہ مارا گیا تو صدیوں تک شاعروں نے اس کے کارناموں کو سراہا اور اس کے گن گائے۔ انھی شعراء نے چھوٹے سے کورنش قصبے کیمل فورڈ کو کیملوٹ؛ بنا دیا جو بلند میناروں سے مزیّن تھا۔ مرلن جادوگر نے ننھے آرتھر کو سمندر کی نویں موج سے اٹھایا اور پانچویں صدی کے قبیلے والے، زمانۂ اوسط کے با تمیز نائٹ بن گئے۔

۴۵۰ء سے ۵۵۰ء تک کے درمیانی عرصے میں شمال مغربی جرمنی کے کچھ قدیم باشندوں اور سیکسنوں نیز زیرین رائن کے جوٹ باشندوں نے برطانیہ پر حملہ کیا اور وہیں رہنے لگے۔ شکست خوردہ برطانوی باشندے ان کے غلام ہوگئے۔ قوی ترین سیکسن بحری سردار بادشاہ بن گئے اگرچہ ان کی قلمرو میں موجودہ ایک کاؤنٹی سے زیادہ علاقہ شامل نہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی باشندے اور سیکسن لوگ ساتھ ساتھ رہنے لگے اور انھوں نے ایک دوسرے

سے بہت کچھ سیکھا۔ سیکسن بھرتی قسم کے لوگ تھے لیکن قوی اور سرگرم۔ انھیں سمندر پر اقتدار حاصل تھا۔ اس کے برخلاف اہلِ برطانیہ اُن سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ اور فن کار تھے، لیکن تھے اپنی طبیعت کے مالک۔ ان میں اپنے فاتحین کے مقابلے میں استقلال کی کمی تھی۔ ایک کو دوسرے کے کردار سے کچھ سیکھنے کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت پوری ہوئی بالخصوص اُس وقت جب آگسٹین نے تمام لامذہبوں کو عیسائی بنا دیا۔

دوسو سال سے کچھ زیادہ عرصے تک برطانیہ پر کوئی حملہ نہ ہُوا۔ رومن، برطانوی اور سکیسنوں کی اِس ملی جلی آبادی سے اُس زمانے کی کچھ عظیم شخصیتیں ابھریں لیکن ۸۵۰ء میں حملوں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا —— اس مرتبہ ناروے اور ڈنمارک کی طرف سے۔ یہ لوگ بھی سمندر کے سورما تھے۔ وہ دریاؤں اور دلدلوں کو کھوندتے ہوئے برطانیہ کے امن پسند کسانوں پر آپڑے اور کامیاب رہے۔ مشرقی اینگلیا، اسیکس اور وسطی میدانوں کا نصف حصہ اہل ڈنمارک کے قبضے میں آگیا حتیٰ کہ لندن تک ان کا ہوگیا۔ سوائے وسیکس کے جو دریائے ٹیمز کے اُس پار واقع تھا۔ اگر ایک ہستی پیدا نہ ہوتی تو آج انگلستان سکنڈے نیویا جیسا ہوتا۔

وہ شخص جس نے انگلستان کا کردار برقرار رکھا، شاہ الیفریڈ تھا جو مغربی سکیسنوں پر حکومت کرتا تھا۔ جب الیفریڈ کو خشکی پر شکست ہوئی اور وہ جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا تو الیفریڈ نے اہل ڈنمارک کو سمندر پر شکست دینے کی ٹھانی۔ اُس نے پہلی برطانوی بحری فوج ترتیب دی اور وسیکس کو حملہ آوروں سے بچا لیا البتہ "ڈین لا" پر وہ لوگ بدستور قابض رہے۔ اہلِ برطانیہ نے آئندہ ہزار سال تک شاہِ الیفریڈ کا سکھایا ہوا سبق یاد رکھا یعنی یہ کہ انھیں سمندر پر اپنی حفاظت کرنی چاہیئے۔

نواں باب

قرونِ اوسط

سنہ ۱۰۶۶ء - سنہ ۱۴۸۵ء

انگلستان کا نقشہ بھی امریکا کے نقشے کی طرح، ہر طرح کے ناموں سے بھرا ہُوا ہے۔ مثلاً ایسے مقامات ہیں جن کے نام کلٹی قسم کے ہیں ـــــ میریزین، پنزائن، پولپیرو جو کارنوال میں واقع ہیں، ڈولگی، ابیرسیٹ وِتھ - للانڈڈلو، کرک سبیتھ اور ایسے ہی سینکڑوں مقامات جو ویلز میں واقع ہیں اور لندن اور کونیٹری وغیرہ جو ملک کے دوسرے حصّوں میں ہیں . . . . رومنوں کے فوجی شہروں کے ناموں کے ساتھ کیسٹرا (کیمپ) لگا ہوُا ہے جو بعد میں چیسٹر ہو گیا ـــــ خود چیسٹر یا ونچسٹر، سرن سسٹر، ڈورچسٹر یا لی سسٹر وغیرہ - کچھ نام اینگلوسیکسن طرز کے ہیں ـــ چپنگ، کینسنگٹن ٹوائی فورڈ، آئل ورتھ، ینڈرولیپ، شپسٹن میلیٹ، فلک شیم یا ڈنمارک طرز کے نام ـــ ہالور گیٹ، سکیگنس، ہوم فرتھ - کہیں کہیں ایسے ناموں کے شہر بھی ملتے ہیں جو آدھے انگریزی ہیں اور آدھے فرانسیسی ـــــ ایشبی ڈی لا، زوچے، تھورپ لی سوکن، ٹروِل، بلوائر - یہ فرانسیسی نام نارمن فتوحات کی یاد دلاتے ہیں۔ ان آخری حملہ آوروں نے یہاں کے عوام پر گہرا اثر چھوڑا ہے - یہاں کا قانون، زبان، رسم و رواج اور ثقافت تک ان سے متاثر ہوئی۔

لندن سے تقریباً پچاس میل دور جنوبی ساحل پر ہیسٹنگز نامی شہر واقع ہے۔ ہیسٹنگز سے چند میل شمال میں سنلاک نامی ایک پہاڑی ہے جہاں ۱۰۶۶ء میں ولیم فاتح نے نہ صرف وسیکس

کا بلکہ پورے انگلستان کا تخت جیتا تھا کیونکہ دسیکس کے شاہ ایلفریڈ اور ڈین لا میں اہل ڈنمارک کی حکومت کے زمانے سے انگلستان پہلے سیکسنوں کی فتح کے بالنتیجہ اور بعد میں شاہِ کینوٹ کے زیرِ اقتدار اہلِ ڈنمارک کی فتح کی وجہ سے متحد ہو گیا تھا۔ جب ایلفریڈ خاندان کا آخری چشم و چراغ ایڈورڈ مر گیا تو تین آدمی تخت کے حقدار بن گئے۔ گوڈون کا بیٹا ہیرولڈ جس کے سر پر فوراً تاج رکھ دیا گیا، اہل ڈنمارک کی طرف سے ہیرولڈ ہرڈراڈا اور نارمنڈی کا ولیم۔ ولیم شاہِ ایڈورڈ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ گوڈون کے بیٹے ہیرولڈ نے اس کی وفاداری اور انگلستان کے تخت سے دست برداری کی قسم کھائی تھی۔ کچھ بھی ہو نئے تاجدار ہیرولڈ پر پہلے ہیرولڈ ہرڈراڈر نے حملہ کیا اور اس کے شکست پانے کے بعد نارمنڈی کے ولیم نے حملہ کر دیا۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے زمانے میں انگلستان کے بہت سے بچے اور بوڑھے ہوم گارڈ تحریک کے تحت شام کے وقت اور چھٹیوں میں اپنے وطن کو جرمنوں سے محفوظ رکھنے کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس وقت اس ہوم گارڈ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جس نے انگلستان کو نارمن حملے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ سیکسن اپنی دفاعی فوج کو "فائرڈ" کہتے تھے لیکن اصل میں وہ "ہوم گارڈ" تھی ——— "مقامی لوگوں کا گروہ"۔ بریٹ ینگ کے بقول ان کے پاس ہتھیاروں کی اتنی ہی کمی تھی جس طرح ان گشتی دستوں کے پاس تھی جو ۱۹۴۰ء میں جرمن حملہ آوروں کے مقابلے میں تعینات کئے گئے تھے۔ ہر چھ آدمیوں کے پاس صرف ایک رائفل تھی۔ شاہ ہیرولڈ کے پاس تین ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کا حفاظتی دستہ (باڈی گارڈ) تھا جو نورڈک جنگی کلہاڑے کے استعمال میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ معمولی سپاہیوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی لیکن اچھے ہتھیاروں کی کمی تھی ولیم کے پاس پانچ ہزار سوار تھے جنھوں نے جدید طریقِ جنگ کی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ نیزے اور تلوار کا استعمال اچھی طرح جانتے تھے۔

دونو طرف کی فوج بہادری سے لڑی۔ ایک ہزار سال سے ولیم کے دلیر جاں نثار ٹیلیفر کا قصّہ مشہور چلا آتا ہے جو نورمن سواروں کے آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ اپنی تلوار ہوا میں اچھالتا تھا اور پکڑتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ایک جنگی ترانہ گاتا تھا حتیٰ کہ سکسینوں کے کلہاڑوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اسی طرح شاہ ہیرولڈ کی ہمّت کے افسانے مشہور ہیں۔ اگرچہ حالات اس کے خلاف تھے اور آخر میں وہ ایک نورمن تیر سے ہلاک ہو گیا۔ نارمنڈی کا ولیم انگلستان کا بادشاہ بن گیا۔ الغرض انگلستان اور فرانس دوستی و دشمنی کے ایک ایسے جال میں پھنس گئے جو صدیوں تک قائم رہا۔

شکست خوردہ انگریزوں کے نقطۂ نظر سے نورمن فتح ایک دل شگاف المیہ تھی۔ ولیم کے پیرو امیر بننے آئے تھے۔ انھوں نے لڑنے کے عوض جائدادیں پائیں جو ولیم نے سیکسنوں سے چھینی تھیں۔

نورمن حملہ آور اپنے ساتھ کچھ اچھی چیزیں بھی لائے جو انگلستان کے حق میں مفید ثابت ہوئیں۔ لوگ انقلاب اور انتقال آبادی سے تنگ آچکے تھے۔ بیرونی حملوں نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔

چاروں طرف بےچینی پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک نورمن وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے حتمی قوانین وضع کیے، کلیسا کی طرف توجّہ کی اور معاشرے کے ہر فرد کے اعمال کا جائزہ لیا۔

نورمنوں نے انگلستان میں جاگیردارانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ تمام جاگیردار بادشاہ کے تابع ہوتے تھے اور تمام کسان اپنے جاگیرداروں کو اپنا آقا سمجھتے تھے۔ کسان اور ان کے غلام سب کے سب اپنے کھیتوں پر رہتے تھے۔ انھیں کہیں اور جا کر کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ غلاموں کو سال میں چند روز جاگیردار کی بیگار بھگتنا پڑتی تھی۔ جاگیردار اپنی رعیّت کو ان کے گھروں سے نکال نہ سکتا تھا بلکہ خطرے کے وقت اس کی حفاظت کرتا تھا۔ انگلستان میں جاگیردارانہ نظام اتنا سخت نہ تھا جتنا فرانس میں تھا۔ نورمنوں

نے انگلستان کے بہت سے قدیم قوانین برقرار رکھے۔ معاشرے کے نچلے طبقے کو اتنی آزادی پہلے کبھی نہ ملی تھی جتنی انھوں نے دی۔ الغرض جاگیردارانہ نظام میں بھی انفرادی آزادی کا ارتقاء جاری رہا۔

اُس زمانے میں اہلِ برطانیہ کو ذاتی آزادی کس درجہ عزیز تھی، اس کا اندازہ اس ردِّ عمل سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ڈومزڈے کتاب[1] کے سلسلے میں ظاہر کیا۔ ویسٹ منسٹر ایبے میں رسمِ تاجپوشی ادا ہونے کے فوراً بعد ولیم فاتح نے حکم دیا کہ اس کی قلمرو میں جتنے کھیت، مکانات، مویشی اور دوسری چیزیں ہیں اُن سب کی مکمل فہرست تیار کی جائے اور ان کے پچھلے دو مالکوں کے نام بھی لکھے جائیں۔ ڈومزڈے کتاب کی دو جلدیں اب بھی موجود ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں اس قسم کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد بھی کوئی کسان اپنے کھیت کے متعلق یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس کا کون حصہ چراگاہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ کون حصہ زیرِ کاشت لایا گیا اور کس حصے پر ۱۰۸۶ء جیسے گئے گزرے دور میں جنگل اُگے تھے۔ اگرچہ انگریزوں کو اس کتاب سے بڑا فائدہ پہنچا لیکن جب اِس سلسلے میں معلومات حاصل کی گئی تھیں تو انھیں بڑا ناگوار گزرا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بادشاہ کو رعایا کے ذاتی معاملات میں دخل دیتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔

رومنوں کی طرح نورمن بھی بہترین انجینئر اور معمار تھے۔ سیکسنوں نے جو کلیسا بنائے تھے وہ گول مٹول، تاریک اور چھوٹے تھے لیکن نورمنوں نے ایسے عظیم کلیسا تعمیر کئے جن کا شمار دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں ہوتا ہے۔ کینٹربری مسیحی معبد، ٹاور آف لندن اور دوسری درجنوں عمارتوں میں ہمیں نورمن محرابیں اپنے ٹیڑھے میڑھے نقوش کے ساتھ آج بھی دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں۔ ان کے مضبوط ستون گزشتہ آٹھ سو سال سے

---

[1] Domesday Book

بلند محراب دار چھتوں کا وزن اٹھائے ہوئے ہیں۔

نورمنوں نے یکے بعد دیگرے تمام مسائل حل کیئے اور جو کچھ سامان ہاتھ آیا اُسے تعمیر میں صرف کیا خواہ گرینائٹ ہو، چھوٹے پتھر ہوں یا قدیم رومن مندروں کی اینٹیں۔ گول محرابوں کے بجائے انھوں نے آہستہ آہستہ نوک دار محرابیں بنانا سیکھا۔ کھڑکیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے بجائے انھوں نے دو، تین اور پانچ پانچ محراب دار کھڑکیاں ایک ساتھ تعمیر کیں۔ بعض اوقات ایک کلیسا کی تعمیر پر بہت زیادہ وقت لگ جاتا تھا لیکن اس طرح فنِ تعمیر کو ترقی ہوئی۔ پتھر کی ایک موٹی دیوار میں اس زمانے کی گول کھڑکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک اور دیوار میں تین تین کھڑکیاں ترتیب وار نظر آتی ہیں۔ مشرق کی طرف ایک عظیم دیوار ہے جس کی نوک دار محرابیں ہیں جو نورمن کے بجائے گوتھک طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک انگلستان کے معمار، خشت ساز، سنگ تراش اور بڑھئی آج کے ماہرینِ تعمیر سے زیادہ سلیقہ رکھتے تھے ورنہ ان کے فن پاروں کی طرف کوئی نظر بھی نہ اٹھاتا اور وہ آج سے بہت پہلے ختم ہو گئے ہوتے۔

پائدار چیزیں اکثر خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔ ان عمارتوں کی تعمیر ان دیانت دار مزدوروں کے ہاتھوں ہوئی ہے جو یہ چاہتے تھے کہ ان کی محنت کے یہ نمونے روزِ قیامت تک ان کے تقدّس کی شہادت دیتے رہیں۔ ہر شخص نے خدا کے حضور میں بہترین ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ سنگ تراشوں نے کلیسا کے ستونوں پر گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی صورتیں کندہ کیں۔ پچھلے حصّے پر کندہ کاروں نے لکڑی پر انگور کی بیل ابھاری ہے۔ مقامی پنٹر نے چرچ کی پچھلی دیوار پر دوزخ کی تیز سرخ رنگ میں عکاسی کی ہے جس میں بڑے بڑے دیو اپنے دانت کھولے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور جو اپنے کانٹوں سے گنہگاروں کو آگ کے شعلوں میں ڈھکیل رہے ہیں۔

وہ کس قسم کے لوگ تھے جنھوں نے یہ قدیم خوبصورت کلیسا تعمیر کئے؟ اُن میں



ملکہ الزبتھ دوم اور ڈیوک آف ایڈنبرا

موڈلن مینار

اکسفورڈ

→





"بگ بین"

گھنٹہ گھر

لنڈن

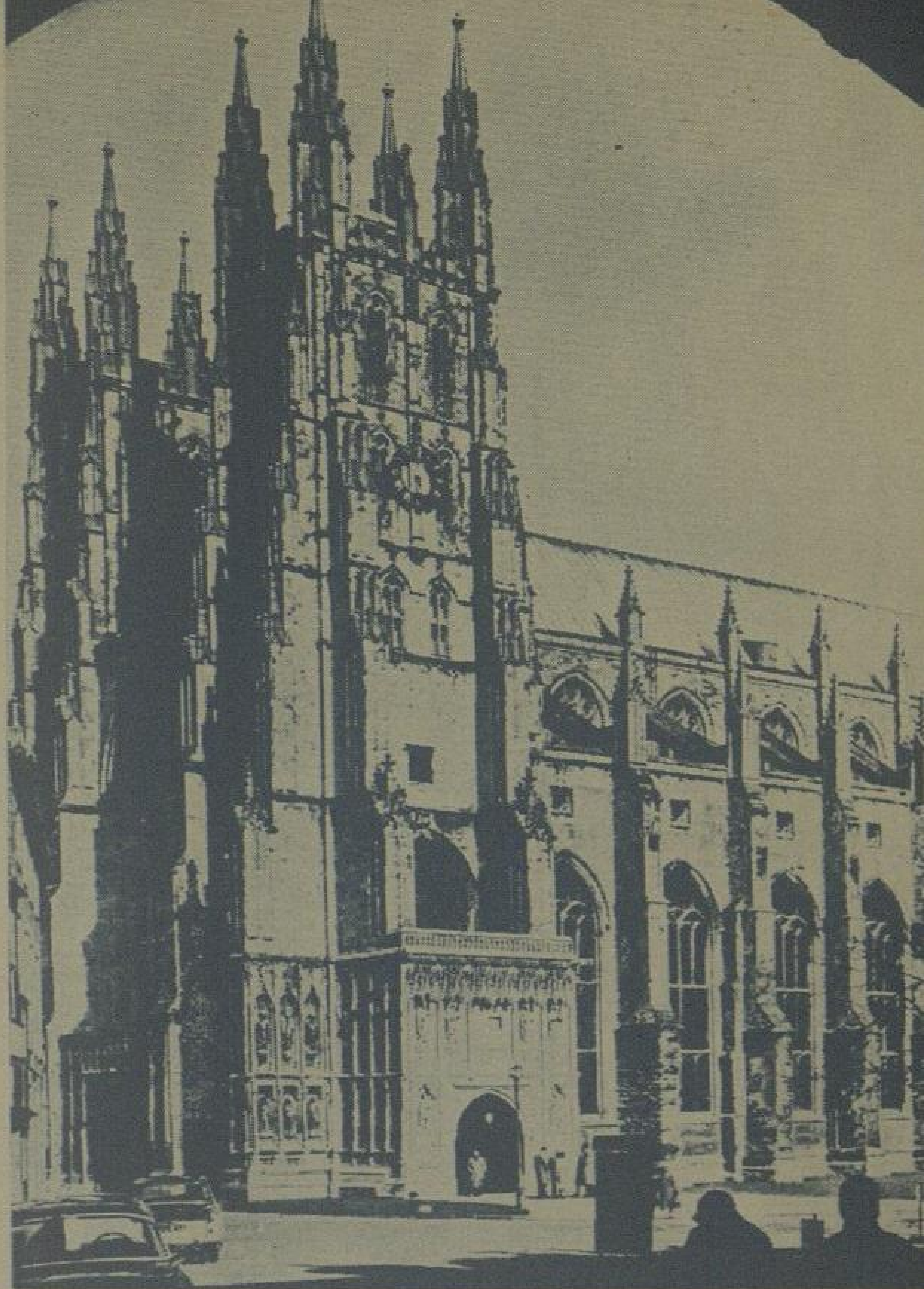
←



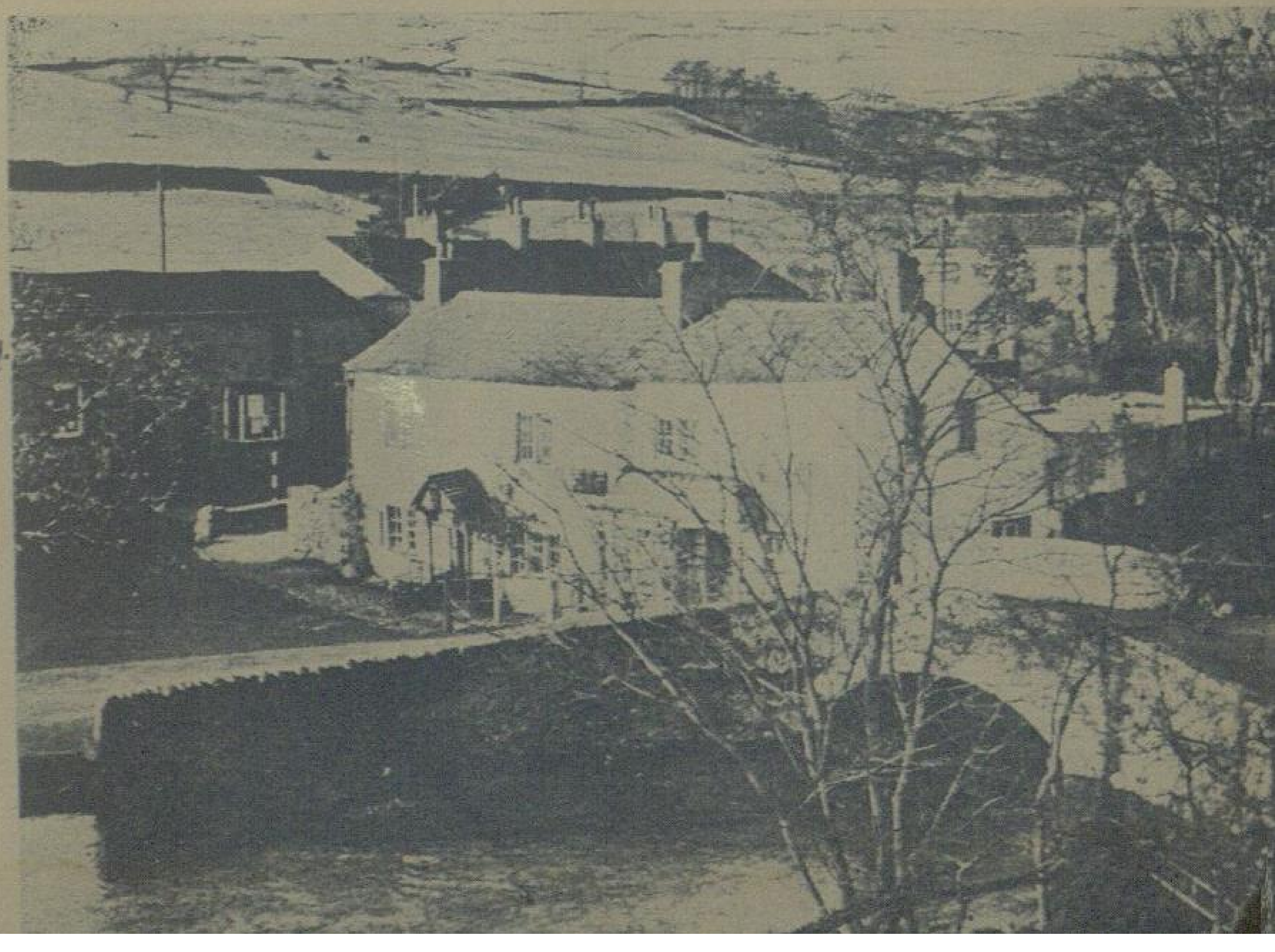
میدانِ سولزبری میں قبل تاریخی

"سٹون ہینج"

کینٹربری
کا
گرجا
→

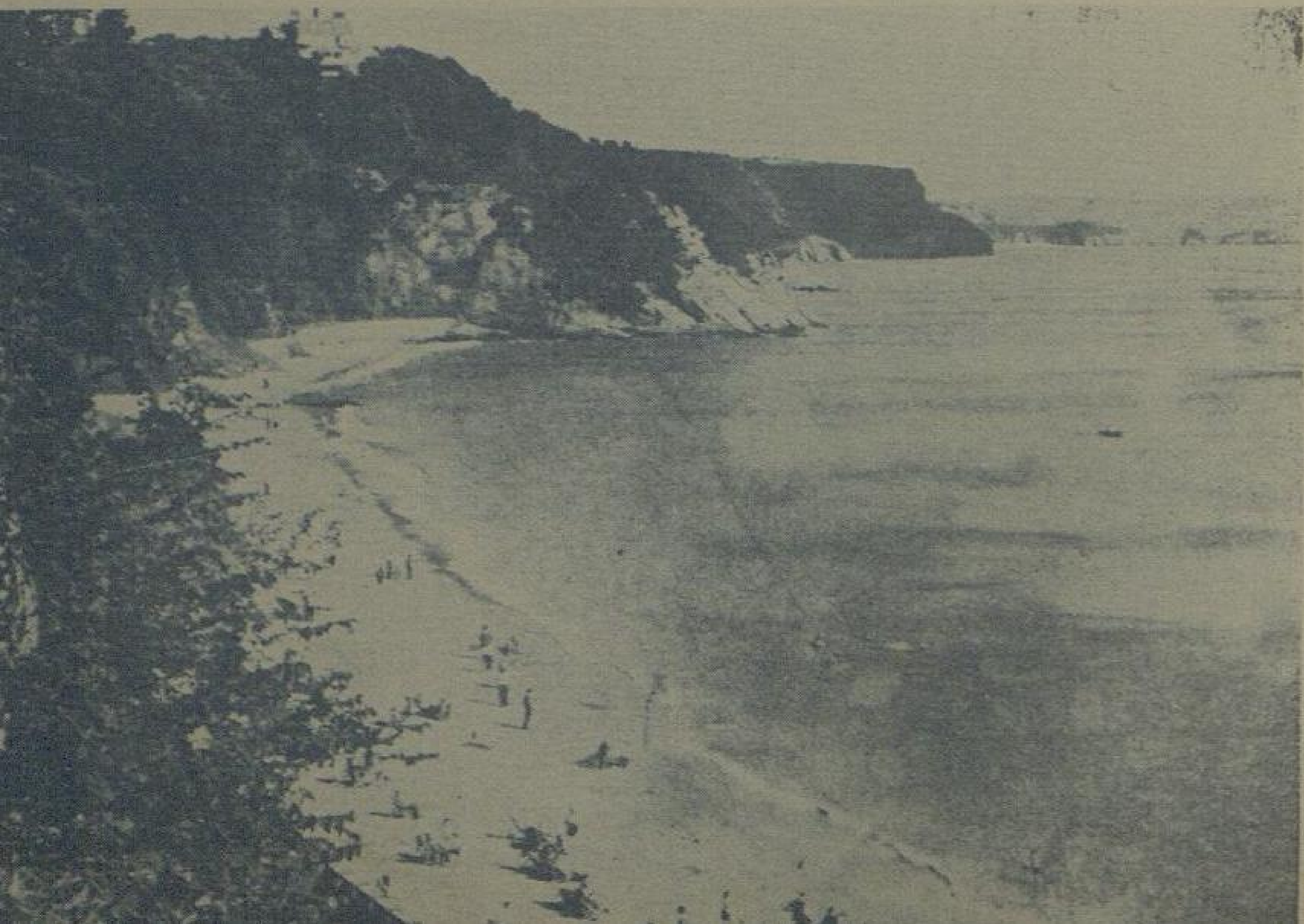


سکپٹن کے قریب یارک شائر کا گاؤں ملہم
اس کے پرے برف پوش پہاڑ دکھائی دیتے ہیں

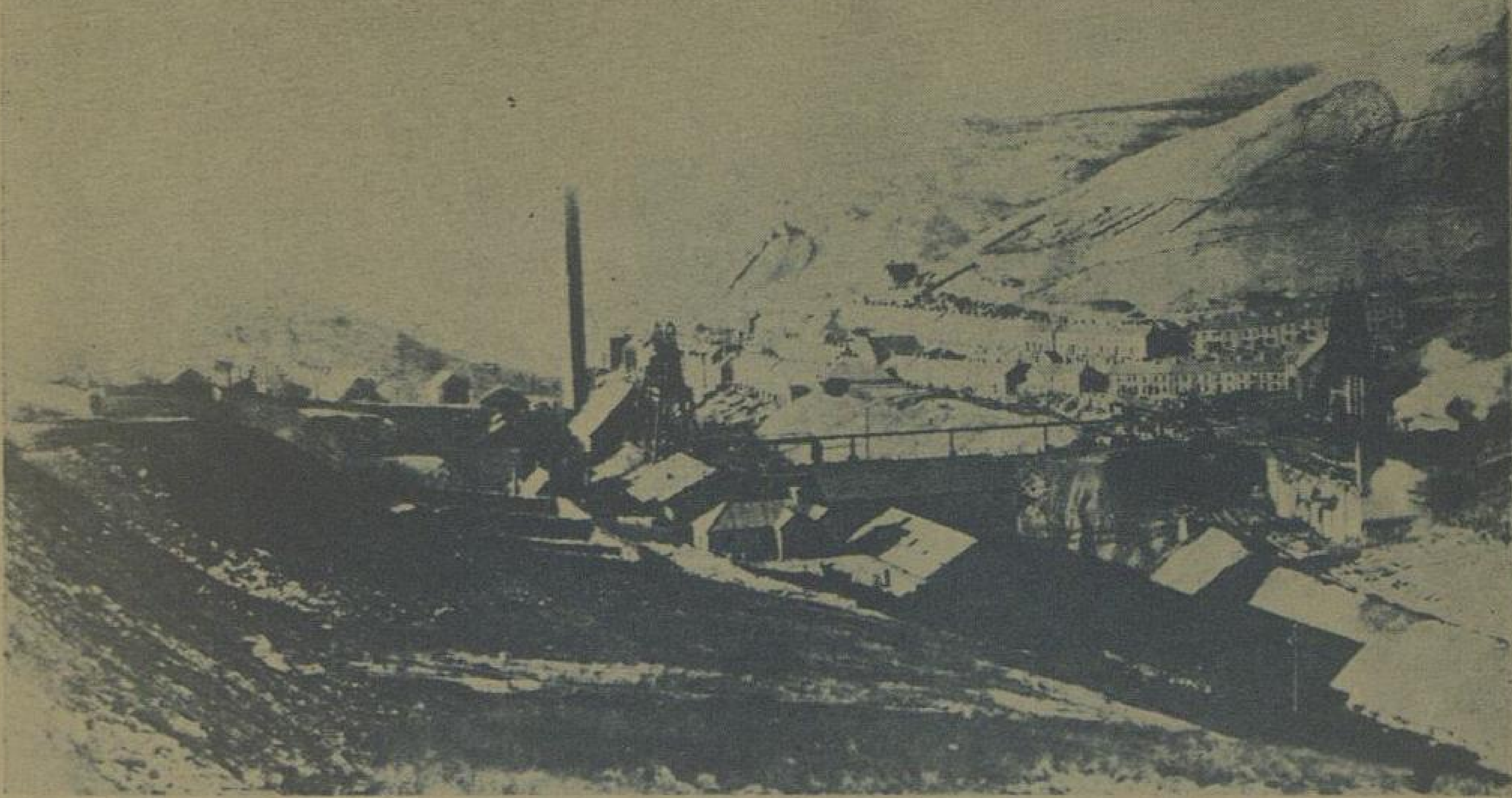




لنڈن کی
ایجنٹس پارک
کا
ایک
دلکش منظر
←

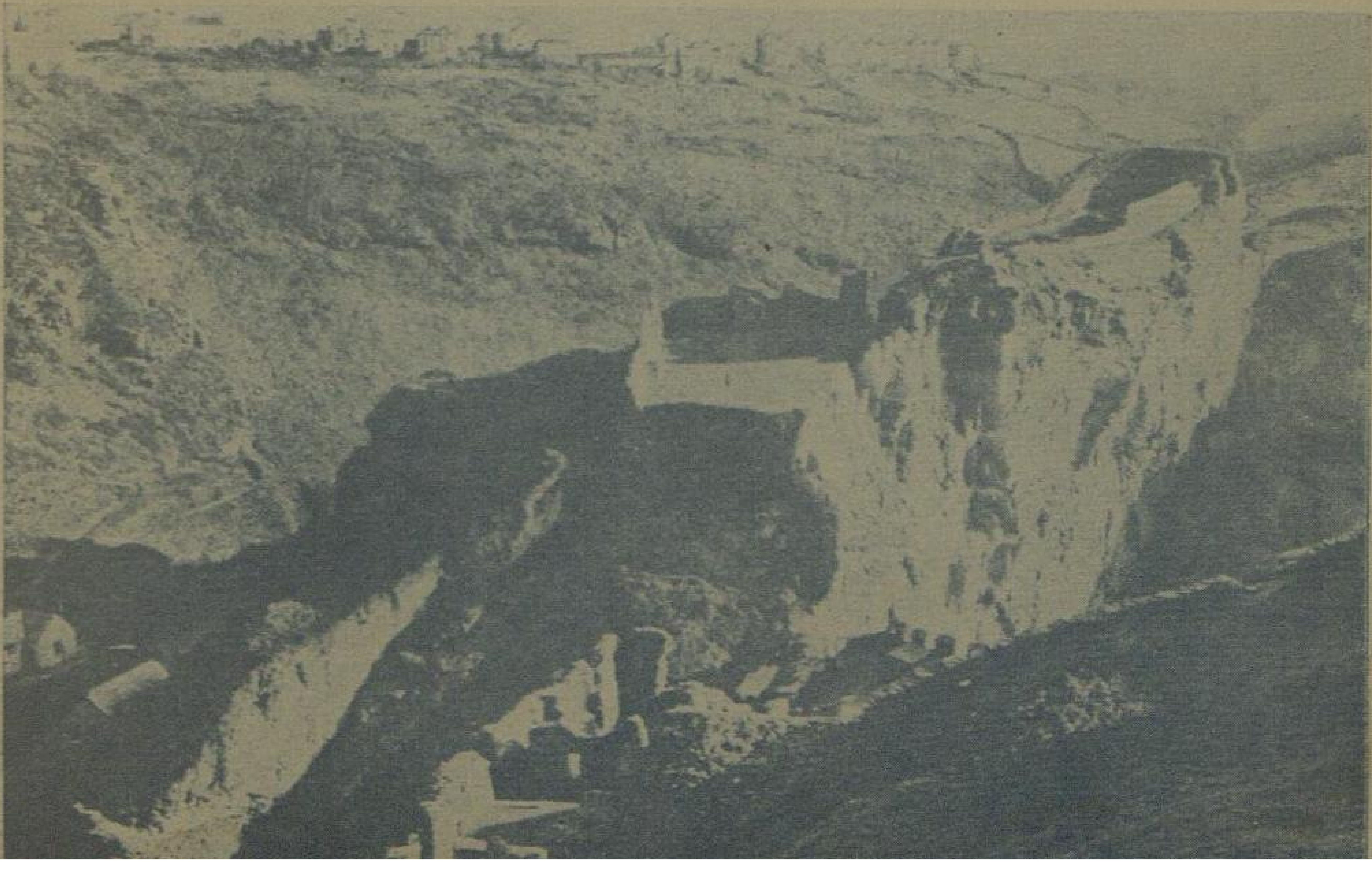


ویلز کے جنوب مغربی
ساحل پر ایک تفریح گاہ



ویلز میں کوئلے کے کان کنوں کا ایک گاؤں

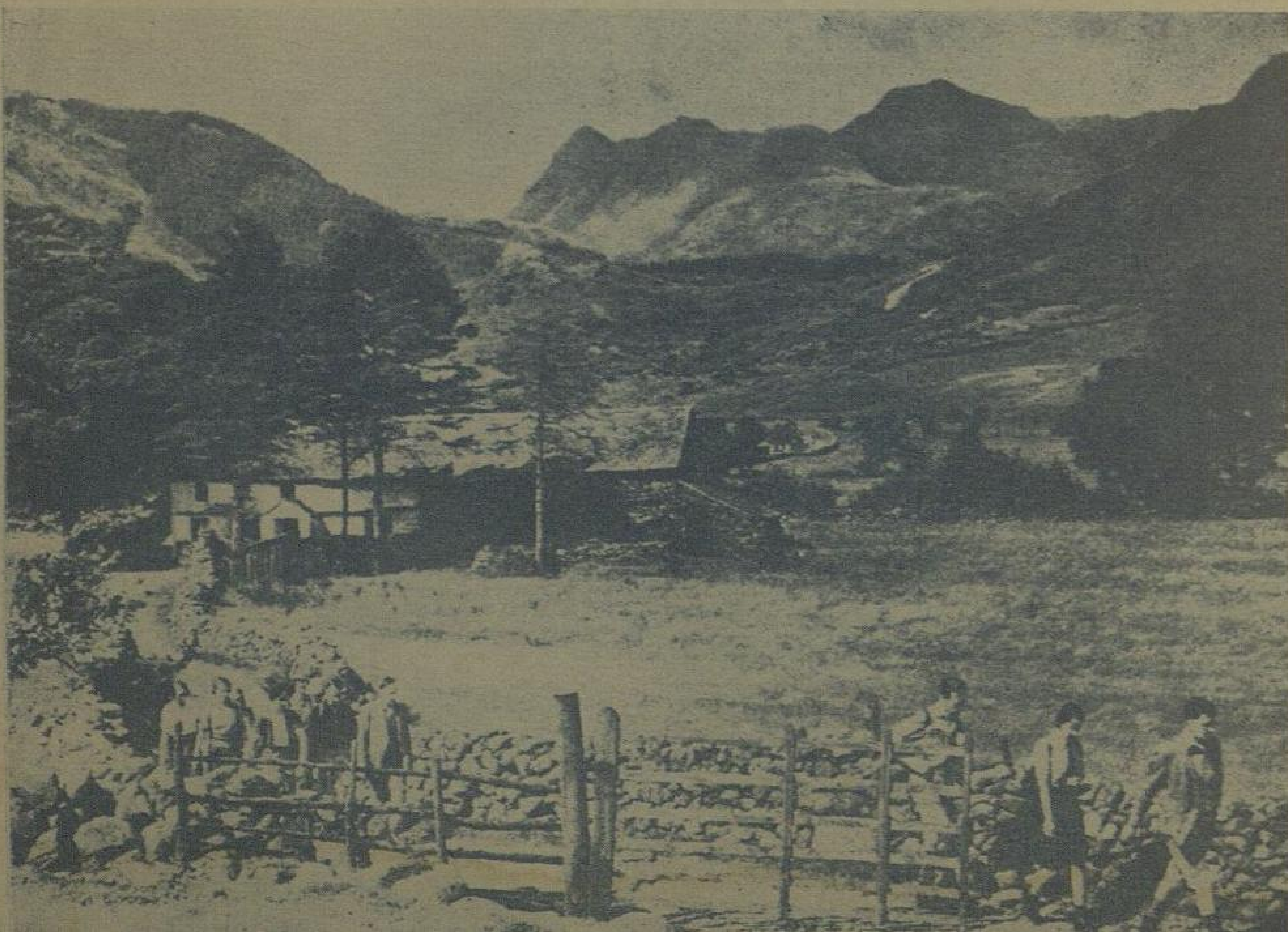
کارنوالی ساحل پر ٹنٹیجل میں شاہ آرتھر کا قلعہ اور سومعہ





↑ ایلی کیتھڈرل کا بلند مینار، میلوں تک دکھائی دیتا ہے

انگلستان کے دیہاتی علاقے کا ایک دلکش منظر





لوشافٹ کی بندرگاہ کے قریب ماہی گیر کشتیوں کا ایک بیڑا

بڈفرڈ آن ایوان ، وارک شر



سے اکثر لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے اس لیے ان کا چھوڑا ہُوا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں۔ اس زمانے کی روح کسی حد تک میگنا کارٹا کے قصّے میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ میگنا کارٹا یا گریٹ چارٹر کو امریکی اعلانِ آزادی کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ نورمن فتح کے بعد چھٹا بادشاہ کنگ جُون تھا۔ اس نے جاگیرداروں کے حقوق کو کسی حد تک دبایا تو وہ اس کے مخالف ہوگئے اور انھوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ اس سے تحریری وعدہ کرے کہ وہ اُن کی مرضی کے بغیر ان پر کوئی ٹیکس عائد نہ کرے گا، نہ کسی کو صفائی کا موقع دیئے بغیر قید کرے گا۔ لندن کے قریب وہ سبزہ زار ابھی تک موجود ہے جہاں ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو بادشاہ نے اس اہم صلح نامے پر دستخط کیے تھے۔ جون کی اس عطا کردہ آزادی کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ انگلستان کے عوام کو یہ حقوق حاصل کرنے میں کچھ دقت لگا۔ ٹھیک پچاس سال بعد سائمن دی مونٹ فورٹ نامی ایک شخص نے لوگوں کو ابھار کر "پارلیمنٹ" کا مطالبہ کرایا تاکہ وہ اپنے خیالات بادشاہ تک پہنچا سکیں۔ شاہ ہنری سوم کو یہ تحریک پسند نہ آئی اور سائمن جلد ہی قتل کر دیا گیا۔ لیکن اگلے بادشاہ ایڈورڈ اوّل نے پارلیمانی نظام شروع کیا اور عوام کے نمائندوں کو اظہارِ خیال کا موقع دیا۔ اس زمانے کے بعض قوانین معمول تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔

اس زمانے میں غریبوں کے لئے زندگی بہت دکھ بھری تھی اور زیادہ تر لوگ بے حد غریب تھے۔ بعض اوقات کوئی جاگیردار اپنی رعیّت سے بیگار کے بجائے ٹیکس وصول کرلیا کرتا تھا۔ رعیّت کے زیادہ تر لوگ بھاگ کر کہیں اور روزی کمانے کی خواہش کرتے تھے انھیں ایسا کرنے کا موقع اس وقت ملا جب انگلستان میں وبائیں پھیلیں۔ معلوم نہیں کتنے لوگ طاعون کا شکار ہوئے۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ملک کی تقریباً نصف آبادی مر گئی۔ پورے پورے خاندان صاف ہو گئے۔ جنازے اٹھانا ناممکن ہو گیا۔ مُردوں کو یونہی ایک گڑھے میں بھر دیا جاتا تھا۔ تیرھویں سے سولھویں صدی تک ان وباؤں کا سلسلہ

وقتاً فوقتاً جاری رہا اور ہر مرتبہ ایسی ہی تباہی آئی۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل جس جگہ لندن کے ایک مشہور سکول کا کرکٹ کا میدان ہے وہاں پلیگ کے مردے دفن کئے گئے تھے اور وہاں کوئی شخص اپنا مکان بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن جنگ عظیم دوم کے زمانے میں یہ کھلی جگہ بڑی کار آمد ثابت ہوئی۔ یہاں پناہ کے لیے خندقیں کھودی گئیں، طیارہ شکن توپیں نصب کی گئیں اور غبارے رکھے گئے۔

اگرچہ بہت سے لوگ طاعون سے مر گئے لیکن جو زندہ بچے ان کے لیے زندگی آسان ہو گئی۔ کھیتوں پر کام کرنے والوں کا ایسا قحط ہؤا کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا سے جان چھڑا کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا تھا اور وہاں آزادانہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا تھا تو کوئی اُس کے ماضی کے متعلق اس سے کچھ زیادہ پوچھ گچھ نہ کرتا تھا۔ مزدوریوں میں اضافہ ہؤا اور کچھ عرصے تک ان لوگوں کو بھی غربت کا احساس نہ ہوا، جن کے پاس زمین نہ رہی تھی۔ جب کچھ عرصہ بعد مزدوریاں کم ہو گئیں تو بے روزگار لوگ متحد ہو کر لندن پر چڑھ دوڑے اور انھوں نے سارے شہر، ٹاور اور شہر پناہ ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ امراء، فضلاء اور مذہبی رہنما اُن سے خوف زدہ ہوئے ہوں گے مبادا یہ لوگ انھیں قتل کر دیں اور شہر کو لوٹ لیں۔ چودہ سالہ بادشاہ رچرڈ دوم نہایت دلیری کے ساتھ تن تنہا اِن کسانوں سے ملنے کے لیے باہر نکل آیا۔ اُس نے اُن سے بہت سے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کیا اور یوں یہ بغاوت فرو ہوئی۔ بیگار کی جگہ کچھ ٹیکس مقرر ہؤا، غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے قانون وضع ہوئے اور باغیوں کو معافی دی گئی۔ رچرڈ واقعی ایک جمہوریت پسند بادشاہ تھا۔ وہ امراء کے بجائے عوام کا سربراہ بننا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ ان دعووں کو پورا نہ کر سکا کیونکہ امراء ان کسانوں کو معاف نہ کرنا چاہتے تھے جنھوں نے انھیں اس درجہ خوف زدہ کیا تھا چنانچہ واٹ ٹائلر اور دوسرے کسان لیڈر قتل کر دیے گئے اور آزادی کے تمام قوانین ختم کر دئے گئے۔ جلد ہی شاہ رچرڈ بھی قتل کر دیا

گیا۔ اُس کی موت کے ساتھ انگلستان میں ملوکیت کا خاتمہ ہو گیا اور سینکڑوں سال تک عوام کو کوئی بادشاہ میسّر نہ آیا۔

اِس عرصے میں انگلستان پر امراء کی ایک مختصر جماعت کی حکومت رہی۔ اگرچہ غریبوں کو یہ اجازت تھی کہ وہ اپنی محنت سے ترقّی حاصل کریں تاہم بہت کم ایسے ہوتے تھے جو اس جماعت کی ہمسری کر سکتے تھے۔ بعض اوقات عوام اس نظام سے تنگ آ جاتے تھے اور اُسے بدلنے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی کبھی اسی پر قانع رہتے تھے مثلاً شکسپیئر کو جمہوریت سے اس قدر کم دلچسپی تھی کہ جب اس نے شاہ جون کے متعلق ایک ڈراما لکھا تو اس نے میگنا کارٹا کا کوئی ذکر نہ کیا اور جب رچرڈ دوم کے متعلق لکھا تو اُس میں کسانوں کی بغاوت اور رچرڈ کے لیڈر بننے کا کوئی ذکر نہ کیا۔

شکسپیئر کی اُس شاعری کو سامنے آنے میں مزید دو سو سال لگے جسے دنیا میں عظیم ترین خیال کیا جاتا ہے۔ اس اثناء میں لندن میں ۱۳۴۰ء یا ۱۳۴۱ء میں انگریزی زبان کا پہلا عظیم شاعر پیدا ہوا۔ موجودہ زمانے میں جیفرے چوسر کو اُتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی ہونی چاہیئے کیونکہ پچھلے چھ سو سال کے عرصے میں انگریزی زبان خاصی بدل چکی ہے آج کے طالب علم کو چوسر کے ہجّے اور عجیب و غریب الفاظ پڑھ کر قدرے وحشت ہوتی ہے اور وہ اُس کی دانائی یا مزاح کی تہ کو نہیں پہنچتا۔ اس کی شاعری کا زیادہ حصّہ ایسا ہے جیسے کسی غیر مانوس زبان میں لکھا گیا ہو۔

بعض اوقات چوسر کی شاعری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ آخر وہ ہے تو قرونِ اوسط کا شاعر اور ہم اس دنیا میں واپس نہیں پہنچ سکتے جس میں وہ رہتا تھا البتّہ وہ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے بہت کچھ سیاحت کی تھی۔ اُس میں مردم شناسی کا ملکہ تھا۔ اور وہ انسانیت سے ہر درجے پر محبّت کرتا تھا وہ بعد کے شعراء کے مقابلے میں زیادہ حسّاس ہے۔

سنہ ۱۴۰۰ء میں چوسر کا انتقال ہؤا۔ اگلی صدی میں تخت کے مدعیان کے درمیان خانہ جنگی جاری رہی جو وار آف روزز[1] کہلاتی ہے۔ عوام نے اس کشمکش کی طرف کم دھیان دیا۔ لیکن امراء آپس میں بری طرح دست وگریبان رہے، حتیٰ کہ جاگیردارانہ نظام کا جنازہ نکل گیا۔ سنہ ۱۴۸۵ء میں شاہ ہنری ہفتم انگلستان کے تخت پر متمکن ہؤا۔ اس وقت تک وہاں کے کسانوں اور کاریگروں نے زیادہ غذا اور کپڑا پیدا کرنے کا سامان مہیا کر لیا تھا۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور انگلستان اُس عظیم انقلاب کے لیے تیار تھا جس نے اسے جدید جمہوریت کا رنگ عطا کیا۔

---

[1] Wars of Roses

دسواں باب

ٹوڈر اور سٹوئرٹ انگلستان

سنہ ۱۴۸۵ء سنہ ۱۶۴۰ء

امریکا کی دریافت دورِ جدید اور قرونِ اوسط کے درمیان حدِ فاصل کا کام کرتی ہے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ہزاروں امریکیوں نے ہنری ہفتم اور اس کی ملکہ الزبتھ آف یارک کے خوبصورت مقبرے کا طواف کیا جو ویسٹ منسٹر ایبے میں واقع ہے لیکن کم لوگ ایسے ہونگے جنھیں یہ خیال آیا ہوگا کہ ہنری کو اُن کے وطن سے بڑی دلچسپی تھی۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں کولمبس کے جزائر غرب الہند پہنچنے سے پہلے ہی برسٹل سے بہت سے جہاز ان ملکوں کی تلاش میں مغرب کی طرف نکل کھڑے ہوئے تھے، جن کا ذکر ملاحوں نے اس وقت سنا جب وہ آئس لینڈ پہنچے۔ وہاں لیف ارکسن کے بحری سفر ابھی تک لوگوں کو یاد تھے۔ ہنری ہفتم نے خود جون کیبٹ کو سنہ ۱۴۹۷ء انگلستان سے نوواسکوٹیا اور نیو فاؤنڈ لینڈ جانے پر آمادہ کیا تھا۔ اس کے بعد اُسے دوسری مرتبہ بھیجا لیکن جون کیبٹ اور اس کے ساتھی غائب ہوگئے۔ تب اسپین اور پرتگال دولت اور قوت کی اس بین الاقوامی دوڑ میں شامل ہوگئے تاہم سولھویں صدی کے دوران میں انگلستان نے نہ صرف بحرِ اطلانتک کے سفر اور نئی دنیا کی معلومات حاصل کرنے میں پیش قدمی کی بلکہ اندرونِ ملک بھی فرانس اور ہالینڈ کے مقابلے میں تجارت کو کہیں زیادہ فروغ حاصل ہوُا، جس نے بعد میں اُسے فائدہ پہنچایا۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں انگلستان میں زندگی بڑی پُر لطف تھی۔ نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ دنیا لوگوں کے وہم و گمان سے زیادہ پھیل رہی تھی اور خود انگلستان میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ سیاست، ثقافت، مذہب —— غرض ہر چیز بدل رہی

تھی کیونکہ ہنری ہفتم نہ چاہتا تھا کہ ملک کے امراء کو کھویا ہؤا اقتدار واپس ملے۔ وہ سیاسی اقتدار نئے آدمیوں کو سونپنا چاہتا تھا جو درمیانی طبقے سے تعلّق رکھتے تھے۔ اس نے اِن لوگوں کا انتخاب اچھی طرح کیا تھا اور گرچہ ملک میں فوج اور پولس کا کوئی خاص انتظام نہ تھا پھر بھی چاروں طرف امن و امان تھا۔ یہ دور سائنسی تجربات کا بھی تھا، جس نے بعد میں کئی اہم ایجادات پیش کیں ـــــ نیوٹن کا نظریۂ تجاذب اور خردبین اور دوربین کی ایجاد۔

بایں ہمہ جس تبدیلی نے عوام کو بہت متاثر کیا وہ مذہب کی تبدیلی تھی۔ اس وقت تک انگلستان رومن کیتھولک رہا تھا۔ بادشاہ اور رعایا دونو چرچ کے معتقد اور وفادار تھے۔ ہنری ہفتم اور ہشتم دونو بادشاہوں نے اس مذہب سے منحرف ہونے والوں کو زندہ جلوا دیا کیونکہ اُس زمانے میں "آزادیٔ مذہب" بہت سے لوگوں کی نظر میں محض شیاطین کی ایجاد کے مترادف تھی۔ ہنری ہشتم کو پوپ نے "محافظ مذہب" کا خطاب عطا کیا۔ بعد کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ برطانوی سکوں پر اب بھی یہ الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

مگر ہنری ہشتم ہی وہ شخص تھا جس نے انگلستان کو پوپ سے آزاد کرایا۔ وہ کیتھولک عقائد سے منحرف نہ تھا لیکن اُس نے انگلستان میں اپنا کلیسا قائم کیا۔ وہ اپنے تخت کے لیے ایک بیٹے کا متمنّی تھا لیکن اس کی ملکہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اس وقت تک کوئی عورت ملکہ نہ بنی تھی۔ اس لیے ہنری کو یہ خدشہ تھا کہ اس کی بیٹی ملک پر حکومت نہ کر سکے گی۔ پس اُس نے دوسری شادی کا تہیّہ کیا اور پوپ سے درخواست کی کہ وہ اسے، اپنی موجودہ بیوی کو اس بنا پر طلاق دینے کی اجازت دے دے کہ اپنے بھائی کی بیوہ سے اُس کی یہ شادی جائز نہ تھی۔ پوپ نے انکار کر دیا۔ ہنری کو بہت غصّہ آیا اور اس نے انتقاماً یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ انگلستان میں پوپ کا کوئی اثر باقی نہ رہے گا بلکہ ملک کا بادشاہ ہی عوام

کا مذہبی رہنما بھی ہوگا۔ مگر قسمت نے ہنری کا ساتھ نہ دیا۔ اُس نے چھ شادیاں کیں۔ لیکن اس کا اکلوتا بیٹا تھوڑے ہی دن حکومت کر کے جوانی ہی میں مر گیا۔ اس کی دو بیٹوں کو عوام نے اپنی ملکہ تسلیم کیا بلکہ اُن میں سے ایک یعنی الزبتھ کا شمار انگلستان کے عظیم فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔

ہنری نے جو کچھ کیا اس کی منظوری پارلیمنٹ سے لی اور یہ اس وجہ سے ممکن ہو سکا کہ انگلستان کے بہت سے لوگ پوپ اور رومن کلیسا کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو پسند نہ کرتے تھے۔ تجدید مسیحیتؔ کی تحریک اسی لیے کامیاب رہی کہ بادشاہ کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ ملک میں کسی قسم کا خون خرابا یا کوئی دوسری بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔ پارلیمنٹ کا اجلاس چھ سال تک جاری رہا جس نے قومی کلیسا کے قیام کے متعلق ضروری قوانین نافذ کیے۔ رومن کیتھولک کلیسا سے متعلقہ زبردست دولت اور جائداد قومی ملکیت قرار دی گئی۔ انگلستان کی کُل زمین کا پانچواں حصہ کلیسا سے متعلق تھا اور بڑی بڑی خانقاہوں کی جائداد بنا ہُوا تھا۔ خانقاہیں توڑ دی گئیں اور راہب اور پجاری منتشر کر دیے گئے۔ کچھ انگریزی کلیسا میں داخل ہو گئے اور کچھ اپنی باقی زندگی کے لیے روپوش ہو گئے۔ کلیسا کی زیادہ تر جائداد کسانوں کو فروخت کر دی گئی جو اُسے جوتنا بونا جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ غلّہ اور اون پیدا کر کے نہ صرف اپنی خوشحالی میں بلکہ ملک کے وسائل میں بھی اضافہ کیا۔ اس طرح جو رقم حاصل ہوئی ہنری نے اُس سے زبردست بحری فوج تیار کی اور فرانس کے ساتھ لڑائیوں کے مصارف برداشت کیے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام نے بادشاہ کی مطلق مخالفت نہ کی۔ ۱۵۳۶ء میں شمالی انگلستان میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ برسوں تک کیتھولک گھرانوں کے نوجوان بغاوت

ؔ Chiristian Revival

کے جرم میں ٹاور میں قید رہے یا بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں قتل کر دیے گئے۔ ان میں سر ٹومس مور بھی شامل تھے۔ جن کا شمار اس ملک کے زعماء میں ہوتا ہے۔

ہنری ہشتم کی حکومت سے چند اور اہم نتائج بھی نکلے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ویلز سیاسی طور پر انگلستان کا حصہ بنا ورنہ صدیوں سے اہل ویلز اور ان انگریز امراء کے درمیان جھڑپوں کا سلسلہ جاری تھا جن کی جائداد دونو صوبوں کی سرحد پر واقع تھی۔ اِن امراء نے آہستہ آہستہ ویلز کا بہت سا حصہ مسخر کر لیا اور وہاں خود مختار سرداروں کی طرح حکومت کرنے لگے لیکن وار آف روزز کے دوران میں انھیں خود انگلستان میں لڑنا پڑا۔ اُن میں سے بہت سے مارے گئے اور اُن کے محلات نیز جاگیریں حکومت کے قبضے میں آگئیں۔ ہنری اتفاق سے خود ویلز کا رہنے والا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ویلز کو انگلستان سے ملا دیا جائے۔ چونکہ اہلِ ویلز کو یہ فخر تھا کہ ان کا ایک ہم وطن انگلستان کے تخت پر متمکن ہے اس لیے وہ ہنری کے وفادار رہے۔ جلد ہی ویلز انگلستان کے قانون کے تحت آگیا۔ اگرچہ اس کی زبان، رسم ورواج اور ثقافت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔

۱۵۴۷ء میں ہنری ہشتم کا انتقال ہوگیا اور اس کا نوجوان بیٹا ایڈورڈ ششم، تخت نشین ہوا لیکن وہ جلد ہی مر گیا اور اس کی جگہ ہنری کی بیٹی میری تخت کی مالک بنی۔ وہ کیتھولک تھی۔ اس لیے اس نے پروٹیسٹنٹوں کے سر قلم کرنے شروع کر دیے۔ عوام کو اِن سیاسی تبدیلیوں کی بہ نسبت اپنے مکان، غذا اور اپنے کپڑے لتّے سے زیادہ دلچسپی تھی جو بنیادی ضروریات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کسانوں کے بہت سے موجودہ مکانات اس زمانے میں تعمیر کیے گئے تھے جب ہنری ہشتم بادشاہ تھا اگرچہ ان گھروں میں رہنے والوں کی تعداد برابر کم زیادہ ہوتی رہی ہوگی۔ سولھویں صدی میں اینٹ یا پتھر کے ان "جھونپڑوں" میں جن کی کھڑکیاں چھوٹی چھوٹی

اور دیواریں تین فٹ کے قریب موٹی ہیں، تین تین بڑے خاندان رہتے تھے۔ ہر خاندان کے پاس اوسط درجے کا ایک کمرا نیچے ہوتا تھا جس میں کھانا پکتا اور کھایا جاتا تھا اور اس کے اوپر اتنا ہی بڑا ایک اور کمرا خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ پانی گاؤں کے کنویں سے آتا تھا اور صفائی ستھرائی کا اکثر اوقات کوئی انتظام نہ تھا۔ بعد میں کہیں کہیں ان خاندانوں کی تعداد تین سے دو رہ گئی۔ ہر ایک کو ایک کمرا اور مل گیا۔ بیسویں صدی میں یہ پرانے گھر ایک ایک خاندان کو مل گئے۔ لوگوں نے بہت کچھ خرچ کر کے ان میں پانی کے نل اور بجلی وغیرہ لگوائی، کھڑکیوں کو فراخ کیا، بڑے سے باورچی خانے کو تبدیل کر کے عمدہ کمرے میں تبدیل کیا اور اس طرح قدامت میں جدت شامل کر کے آرام کا نیا سامان پیدا کیا۔

سولھویں صدی کے تمام مکانوں میں چار چار یا چھ چھ کمرے نہ تھے۔ خانقاہوں کے اختتام سے قبل گرجا گھروں، راہبوں کی طعام گاہوں اور ان کی نجی قیام گاہوں میں آرائش کی تمام چیزیں ہوتی تھیں۔ جب بادشاہ کے حکم سے کلیسا کی جاگیر نیلام کر دی گئی تو کسانوں نے راہبوں کی قیام گاہوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ امراء کے یہ مکانات جلد ہی غریبوں کے قبضے میں چلے گئے جنھوں نے ان کے فرش پر پھونس بچھا کر ان میں سادہ زندگی کا آغاز کیا۔ کسی قسم کی حفاظت یا استحکام کی ضرورت باقی نہ رہی۔ شرفاء اور امراء نے راہبوں کی نقل کی۔ اور اپنے نئے گھروں میں بڑی بڑی کھڑکیاں بنوائیں۔ خواب گاہیں اور بیٹھکیں تعمیر کی گئیں اور ہال بھی۔ ان کی سیڑھیوں پر خوبصورت جنگلے اور آتش دانوں میں سیکس کا لوہا لگایا گیا دیواروں پر بلوط کا استر یا خوبصورت پردے لٹکائے گئے۔ باورچی خانے کے سوا باقی سب کمروں میں بلوط کے فرش بچھائے گئے۔ بڑے بڑے مکانوں میں طعام گاہ کے ایک سرے پر گانے بجانے کے لیے ایک گیلری تعمیر کی گئی تاکہ امراء کھانا کھاتے وقت موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ فرش سے گیلری تک لکڑی کا ایک پردہ تھا جس پر اطالوی یا مقامی کاریگر

کندہ کاری کرتے تھے ۔ اس کا انحصار صاحبِ خانہ کی مالی استطاعت پر ہوتا تھا ۔ لیکن اب وہ وقت نہ رہا تھا جب کاریگر اور اہلِ فن اس قدر تعاون کے ساتھ کوئی مکان یا عمارت تعمیر کرتے تھے کہ کسی کے کمال کا الگ پتہ نہ چلتا تھا ۔ قرونِ اوسط کے کاریگروں کا باہمی اتحاد ختم ہوتا جا رہا تھا ۔ اب تمام کاریگر علیحدہ علیحدہ اپنے کمال کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے ۔

انگلستان میں ابھی تک سینکڑوں ٹوڈر محلات زیرِ استعمال ہیں ۔ ان سے بھی زیادہ شاندار وہ عمارتیں ہیں جو اُس زمانے میں عوام کے لیے وقف تھیں ۔ مثلاً وہ کلیسا جو تجدیدِ مسیحیت سے ذرا پہلے تعمیر کیے گئے تھے یا ان میں توسیع کی گئی تھی ، آکسفورڈ اور کیمبرج کی دانش گاہیں ، مارکیٹ ہال ۔ شاہی محلات جن کی عظیم گیلریوں میں بڑے بڑے آئینے نصب ہیں اور جن میں آج عام شہری گھومتے پھرتے ہیں یا وہ خوبصورت باغ جو بادشاہوں کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے ۔

الغرض اس زمانے کے مکانات فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں ——— موزوں کمرے ۔ دیواریں اور فرش اتنے دبیز کہ اندر کی ہوا باہر نہیں جا سکتی ، الماریاں اتنی بڑی کہ پوری فصل ان میں محفوظ کر دی جائے ۔ پیتل کی ایسی خوشنما چیزیں کہ انھیں بجا طور پر عجائب گھروں کی زینت بنایا جا سکے ——— شاید یہی وجہ تھی کہ جب دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد انگلستان میں مکانات کی سخت قلت محسوس ہوئی اور عارضی قیام گاہیں تعمیر ہوئیں تو انگریزوں نے انھیں پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا ۔ تعمیر کے معاملے میں ان کا مذاق اونچا رہا ہے ۔ اس لیے سستی قسم کی یہ عمارتیں ان کی نگاہ میں نہ آ سکیں مثلاً انھیں جدید طرز کا باورچی خانہ درکار تھا لیکن وہ ساتھ ساتھ عمدہ تعمیر ، فراخی اور استحکام کے بھی خواہش مند تھے جو ان کی روایات میں شامل تھا ۔

امریکا کی طرح انگلستان میں بھی سولھویں اور سترھویں صدی میں خیر و شر میں گھرا

اختلاط پایا جاتا تھا۔ جب کسانوں کو "مشترکہ زمینوں" کے چاروں طرف جنگلے لگانے کی اجازت مل گئی جن پر دیہاتی صدیوں سے اپنے مویشی چراتے چلے آئے تھے تو نتیجہ اچھا نکلا۔ ان مشترکہ زرخیز چراگاہوں کو کاشت کرنے سے ملک کی پیداوار میں اضافہ ہؤا۔ اس کے برعکس ہزاروں چھوٹے چھوٹے کسانوں کو جو تھوڑا بہت معاوضہ ملا اسے انھوں نے جلد خرچ کر ڈالا۔ جب زمین بھی نہ رہی تو انھوں نے شہروں کا رخ کیا اور وہاں محنت مزدوری کرنے لگے۔ جب انگلستان کی آبادی بڑھی تو زیادہ غذا کی ضرورت پڑی۔ غذائی اشیاء کی قیمت چڑھ گئی۔ مزید مشترکہ قطعات کے چاروں طرف قانوناً باڑھ لگائی گئی اور ان میں گیہوں کی کاشت شروع کی گئی۔ بڑے کسان امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور دیہاتی زیادہ سے زیادہ تعداد میں سڑکوں پر آ پڑے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ہنری ہشتم کے اڑتیس سالہ دورِ حکومت میں ۷۲۰۰۰ چوروں کو پھانسی دی گئی جن میں غالباً بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنے بچوں کے لیے روٹی چراتے پکڑے گئے۔ ۱۵۷۲ء میں یہ کیفیت تھی کہ انگلستان نے غریبوں کی امداد کے لیے ٹیکسوں کے ذریعے سے دولت جمع کی تھی، ملکہ الزبتھ کے دورِ حکومت میں ایک نہایت مشہور قانون وضع ہؤا تھا جسے قانونِ غربا[1] کہتے ہیں اور جس کے تحت ایسی "کارگاہیں" تعمیر کی گئیں جن میں بے سہارا لوگ رہتے تھے اور کلیسائی نظام کے تحت کام کرتے تھے۔

اس عہد کی چند اور برائیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انگلستان کے دوسرے فرمانرواؤں کی طرح ملکہ الزبتھ اول نے مفتوحہ آئرلینڈ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شمالی امریکا میں سفید فام اقوام نے ریڈ انڈین باشندوں کے ساتھ کیا۔ آئرلینڈ تو بہت پہلے فتح کیا جا چکا تھا لیکن وہاں کے باشندے بیرونی اقتدار کو پسند نہ کرتے تھے لہٰذا سکاٹ لینڈ اور

---

[1] Poor Law

انگلستان کے پروٹسٹینٹ" آباد کاروں" کو آئرلینڈ میں زمینیں دی گئیں اور انگلستان کی خوشنودی کے لیے آئرلینڈ کی تجارت پر اقتدار حاصل کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ آئرلینڈ جو پہلے خوشحال تھے، نہایت غریب ہو گئے۔ وہ اہل انگلستان سے نفرت کرنے لگے اور یہ نفرت کبھی ختم نہ ہو سکی۔

اب سکاٹ لینڈ اور انگلستان کے باشندے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے آباو اجداد نے سولھویں اور سترھویں صدی میں بڑی شقاوت کا ثبوت دیا تھا۔ انھیں اس بات کا افسوس ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کا ازالہ کس طرح کریں۔ امریکیوں نے اس قسم کے مظالم کی تلافی اس طرح کی تھی کہ انھوں نے مقامی باشندوں سے چھینی ہوئی زمینیں انھیں واپس کر دی تھیں اور جن حبشیوں کو غلاموں کے جہازوں میں تکلیف ہوئی تھی، انھیں افریقہ واپس بھیج دیا تھا۔ آئرلینڈ کے پروٹسٹینٹ وہاں تین سو سال سے رہ رہے ہیں۔ انھیں وہاں سے نکالا جاتا تو انصاف کا خون ہوتا اور پورے ملک کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ ان میں سے بیشتر شمالی آئرلینڈ میں رہتے ہیں اور برطانوی نظامِ حکومت پر قانع ہیں۔ ان کا رشتہ انگلستان اور سکاٹ لینڈ سے مستحکم ہے۔ جنوبی آئرلینڈ (آئر) کے عوام کی اکثریت کیتھولک ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کا ملک خود مختار ہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ شمالی آئرلینڈ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر خود مختار ہو جائے۔ جنگ کے زمانے میں آئر نے انگلستان کی کوئی مدد نہ کی۔ وہ غیر جانب دار رہا۔ اس کے باوجود ہزاروں آئرش شہری بحیرۂ آئرلینڈ کو پار کر کے انگلستان پہنچے اور وہاں کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ان میں کچھ اپنی حکومت کے طرزِ عمل کو پسند بھی کرتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے ایسا کیا۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگلستان کا "دورِ زریں" وہ تھا جب الزبتھ اس کے تخت پر متمکن تھی۔ ملکہ الزبتھ نے ۱۵۵۸ء سے ۱۶۰۳ء تک حکومت کی اور

اگرچہ اس کی رعایا میں کچھ لوگ غریب بھی تھے تاہم اس کے دورِ حکومت میں ملک کی دولت دانش اور قوت سب میں غیر معمولی اضافہ ہُوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ الزبتھ کو بحیثیت ایک فرمانروا کے کوئی دشواری پیش نہ آئی انگلستان اسپین کے مقابلے میں کمزور تھا۔ اس کا سرکاری مذہب پروٹسٹینٹ تھا۔ لیکن ملک میں بہت سے کیتھولک بھی موجود تھے جو اسی مذہب کے کسی پیرو کو اپنا بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ کیتھولک کلیسا پھر برسرِ اقتدار آ جائے۔ الزبتھ کی چچا زاد بہن، میری اسٹوئرٹ، اسکاٹ لینڈ کی ملکہ کیتھولک تھی اور انگلستان کے تخت پر کچھ حق رکھتی تھی۔ انگلستان کے کیتھولک باشندے اور اہلِ اسپین یہ امید باندھے تھے کہ کسی صورت الزبتھ راستے سے ہٹ جائے اور میری سٹوئرٹ ملکہ بن جائے۔ الزبتھ کے باپ نے کلیسا کی جو جاگیریں ضبط کی تھیں وہ بھی اس طرح بحال ہو سکتی تھیں۔

الزبتھ جانتی تھی کہ خطرہ سامنے ہے لیکن اس نے عرصۂ دراز تک کوئی خاص قدم نہ اٹھایا۔ میری سٹوئرٹ سکاٹ لینڈ کے تخت سے اتار دی گئی تو وہ بھاگ کر انگلستان پہنچی جہاں اس کی موجودگی الزبتھ کے اقتدار کے لیے ایک چیلنج تھا لہٰذا الزبتھ نے اُسے قید کرنے کا حکم دے دیا مگر قید میں اسے ہر طرح کی سہولت اور آرام دیا گیا تھا۔ میری کے اپنے ملازمین اس کے ساتھ تھے۔ جب تک میری زندہ رہی الزبتھ کی جان لینے کے منصوبے بنتے رہے تاکہ میری کو انگلستان کے تخت پر بٹھا دیا جائے بالآخر ۱۵۸۶ء میں ایک ایسی سازش کا سراغ لگا جس میں میری کا بہت کچھ ہاتھ تھا لہٰذا الزبتھ نے اسے موت کی سزا دی۔ میری کی عمر اب پینتالیس ۴۵ سال ہو چکی تھی اور اس کا نسوانی اور رومانی حسن بہت کچھ رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت بہادری سے جان دی۔ مرنے سے ایک دن قبل اس نے ایک خط اپنے بہنوئی شاہِ فرانس کو لکھا۔ اس کا طرزِ تحریر نہایت نفیس اور متوازن ہے۔ اُس سے ذرا بھی مترشح نہیں ہوتا کہ لکھنے والی سترہ سال تک قید خانے میں رہی ہے۔

میری کے مرنے کے بعد بھی الزبتھ کی دشواریاں ختم نہ ہوئیں۔ اسپین اور انگلستان کے درمیان جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں، پھر بھی فلپ شاہِ اسپین نے انگلستان کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کیا۔ کیونکہ اسے یہ امید تھی کہ الزبتھ کو کوئی شخص قتل کر دے گا، میری وہاں کی ملکہ ہو جائے گی اور انگلستان خود بخود کیتھولک ہو کر اسپین کا دوست بن جائے گا۔ جب میری ختم ہو گئی تو فلپ کو احساس ہؤا کہ اب مزید وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے ایک بہت بڑے بحری بیڑے کی تیاری کا حکم دیا جو لکڑی کا تھا۔ ایک سال کے اندر اسپین کا آرمیڈا انگلستان پر حملہ کرنے کے لیے شمال کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ جولائی ۱۵۸۸ء سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔

بدقسمتی سے ہسپانوی حملہ آور بحری جنگ کے جدید طریقوں سے ناواقف تھے وہ سمندر پر بھی خشکی کی طرح لڑنے کے متوقع تھے یعنی ایک طرف کے سپاہی دوسری طرف پہنچ کر دست بدست جنگ کریں اور دشمن کے زیادہ سے زیادہ جہازوں پر قبضہ کر کے اُسے مغلوب کر لیں۔ اس وقت تک سمندر پر تمام لڑائیاں اسی طرح لڑی گئی تھیں۔

سولھویں صدی میں انگریزوں اور اہلِ ڈنمارک نے بحری جنگ کا ایک اور طریقہ سیکھا۔ انھوں نے تیز رفتار چھوٹے چھوٹے جہاز بنائے اور ان کے نچلے نیز بالائی حصوں پر توپیں نصب کیں۔ انھوں نے سپاہیوں کی تعداد کم سے کم رکھی اور ہوا کی سمت خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنے جہازوں کو تیزی سے گھما سکتے تھے۔ اہلِ اسپین ان جہازوں کو پکڑنے یا ان پر سوار ہونے میں ناکامیاب رہے۔ انگریزوں نے دور ہی سے دشمن کے جہازوں پر گولہ باری شروع کر دی اور جب گولا بارود ختم ہو گیا تو انھوں نے غنیم پر حملہ کر کے اس کے جہازوں کو آگ لگا دی۔ پیشتر اس کے کہ اسپین کے کثیر سپاہی ان سے لڑنا شروع کرتے، انگریزوں کے یہ چھوٹے چھوٹے جہاز جلدی سے واپس پلٹ آئے۔

باقی ماندہ آرمیڈا کو تیز ہواؤں نے رود بارِ انگلستان میں دھکیل دیا اور وہ سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے مغربی ساحل سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ جو زندہ بچے انھوں نے جنوب کی طرف بچ نکلنے کی کوشش کی۔ اِس جنگ میں انگلستان کے سو سے بھی کم سپاہی کام آئے۔

آرمیڈا کی شکست نے انگلستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ یہ جنگ ملکہ کے لیے جیتی گئی تھی لیکن ملکہ نے نہیں جیتی تھی۔ اسپین کو شکست دینے میں مختصر شاہی بحریہ کا اتنا حصہ نہ تھا جتنا تجارتی جہازوں کا تھا۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے معمولی تاجر جو اون برآمد کرتے تھے اور تمباکو، شکر اور ریشم درآمد کرتے تھے، اب اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگے تھے۔ جب اگلے دو بادشاہوں، جیمز اول اور چارلز اوّل نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ظلِ سبحانی ہیں اور انھوں نے پارلیمنٹ کی قوت توڑنے کی کوشش کی تو یہی لوگ جنھوں نے آرمیڈا کو شکست دی تھی، ظالم و جابر بادشاہ کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

الزبتھ کے دورِ حکومت کا سب سے شاندار کارنامہ آرمیڈا کی شکست نہ تھا، نہ ملکہ خود کسی غیر معمولی عظمت کی مالک تھی۔ الزبتھ ٹوڈر کا سیاسی شعور اپنی رعایا کے ایک فرد، ولیم شکسپیئر کی غیر معمولی ذہانت کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود شکسپیئر اب بھی انسانی محسوسات کا زبردست ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ آج کے مصنفین بھی اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ انگلستان کے سکولوں کے بچّے ہر سال شکسپیئر کے ڈرامے پیش کرتے ہیں، لیکن انھیں امریکی بچوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے، جو شکسپیئر کی جگہ درحاضر کے کسی ڈراما نویس کا کھیل منتخب کرتے ہیں تاہم ان کے ذہن میں وہ مکالمے محفوظ رہتے ہیں۔ جن کا مفہوم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

گیارھواں باب

برطانوی اور امریکی انقلابات

سنہ ۱۶۴۰ء — سنہ ۱۸۱۵ء

اکثر بڑے ملکوں میں انقلابات آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے لیے زندگی کی لذّتوں سے بہرہ ور ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں سنہ ۱۷۷۶ء اور سنہ ۱۷۸۹ء جیسے گئے گزرے زمانے میں انقلابات آئے۔ کسی وجہ سے اصطلاح "برطانوی انقلابات" عام طور پر استعمال نہیں کی جاتی، اگرچہ اہلِ برطانیہ کو انقلابات سے واسطہ ضرور پڑا ہے اور وہ بھی سب سے پہلے۔ ان کے ہاں سنہ ۱۶۴۰ء میں انقلاب شروع ہوا۔

برطانوی انقلابات میں قومی خود مختاری حاصل کرنے کا سوال نہ پیدا ہوا تھا، ورنہ برطانوی اور امریکی انقلابات بہت کچھ ایک جیسے ہیں۔ امریکیوں کا نعرہ تھا "نمائندگی کے بغیر کوئی ٹیکس نہ لگنا چاہیئے" کیونکہ نوآبادکاروں کو یہ خیال تھا کہ جو بھی ان پر ٹیکس عائد کرے گا وہی اس سرزمین کا حاکم ہے۔ وہ یہ اختیار سمندر پار انگلستان کی پارلیمنٹ کو دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۶۴۰ء میں بادشاہ کو خیال آیا کہ ٹیکس لگانے کا اختیار اسے ہونا چاہیئے، لیکن پارلیمنٹ نے اس سے انحراف کیا، جیسا کہ امریکیوں کو بعد میں احساس ہوا، انگریزی پارلیمنٹ کا یہ خیال تھا کہ مالی اقتدار ہی اصلی اقتدار ہے۔ ملکہ الزبتھ بڑی دانشمند تھی پارلیمنٹ سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے کیونکہ اس نے اپنے اخراجات کم سے کم رکھے۔ اس کے برعکس چارلز اوّل اپنے آپ کو خدا کا سایہ سمجھتا تھا اور اپنی مرضی کے مطابق زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔

جنگ شروع ہونے سے بہت قبل چارلز کو مشکلات کا سامنا ہونے لگا تھا۔ ۱۶۲۸ء میں اس نے پارلیمنٹ سے رقم مانگی اور اس کے بدلے ایک دستاویز پر دستخط کیے جسے "عرض داشت حقوق"[1] کہتے ہیں۔ بادشاہ نے تحریری وعدہ کیا کہ جب تک کوئی شخص قانون شکنی نہ کرے وہ اُسے قید نہ کرے گا اور پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر وہ کسی کو تحفہ پیش کرنے، قرض دینے یا ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہ کرے گا۔ پارلیمنٹ نے فوراً اتفاقِ رائے سے یہ طے کیا کہ وہ بادشاہ کے اخراجات کے لیے زندگی بھر کے لیے منظوری دینے کے بجائے ہر سال منظوری دیا کرے گی، جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ چارلز کو یہ بات بہت بری لگی۔ پارلیمنٹ کے ارکان عجب مشکل میں پھنس گئے اگر وہ بادشاہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو غدّار کہلاتے ہیں جس کی سزا موت ہو سکتی تھی اور اگر اس کی تائید کرتے ہیں تو گویا ظلم کی حمایت کرتے ہیں جسے ہم مطلق العنانی کہتے ہیں۔ بالآخر پارلیمنٹ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ سپیکر نے اپنی کرسی چھوڑ دینے کی کوشش کی کیونکہ وہ ایسے ہنگامی اور باغیانہ اجلاس کی صدارت نہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھیوں نے اسے اٹھنے نہ دیا اور بادشاہ کی جماعت کے خلاف تین قرار دادیں منظور کر کے دم لیا۔ اس کے بعد پارلیمنٹ منسوخ ہو گئی۔ چارلز نے عہد کیا کہ وہ پارلیمنٹ اور اس کے ٹیکسوں کے بغیر ہی حکومت کرے گا۔ گیارہ سال یونہی گزر گئے۔ اس کے بعد چارلز کو پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

جب ۱۶۴۰ء میں نئی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا تو چاروں طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ سکاٹ لینڈ میں بغاوت پھوٹ چکی تھی اور جب الزبتھ کے انتقال کے بعد سکاٹ لینڈ کا بادشاہ جیمز پنجم انگلستان کا جیمز اول بن گیا تو انگلستان بھی اس بغاوت میں شریک ہو گیا۔ انگلستان پر سکاٹ لینڈ کی فوج نے شمال سے حملہ کیا۔ چارلز کو فوج اکٹھی کرنے اور باغیوں

---

[1] Petition of Right

کو کچلنے کے لئے سرمائے کی ضرورت پڑی۔ وہ پھر اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن پارلیمنٹ کے ارکان اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

اس جنگ کے آغاز میں پارلیمنٹ کے پاس رقم تو بہت تھی لیکن فوج نہیں تھی بادشاہ کے پاس بہت بڑی فوج تھی جو تربیت یافتہ بھی تھی اور ایسے سرداروں کی کمان میں تھی جو بادشاہ کے وفادار تھے، لیکن بادشاہ ان کی تنخواہ ادا نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کئی لڑائیوں میں ہار گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پسپا ہو جائے گی لیکن رفتہ رفتہ اس کی فوج کو تجربہ حاصل ہوا اور آخر میں اُسے وہ لیڈر اور جنرل ملا جسے تاریخ اولیور کرامویل کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ بادشاہ کو رسد کے لیے رقم جمع کرنے میں زیادہ سے زیادہ دشواریاں پیش آتی رہیں حالانکہ اس کے دوستوں نے اس کی رفاقت میں اپنی موروثی جائدادیں تک فروخت کر دیں۔ دونوں طرف اچھے لوگ تھے لیکن ان کے خیالات مختلف تھے۔ جب لڑائی عملی طور پر شروع ہو گئی تو پارلیمنٹ کے کچھ زعماء بادشاہ کی طرف چلے گئے کیونکہ وہ حلفِ وفاداری کے پابند رہنا چاہتے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بادشاہ غلطی پر ہے۔

یہ جنگ ۱۶۴۲ء سے ۱۶۴۶ء تک جاری رہی۔ بالآخر مئی ۱۶۴۶ء میں بادشاہ بھاگ کر سکاٹ لینڈ چلا گیا اور وہاں اس نے اپنے تئیں اہل سکاٹ لینڈ کے سپرد کر دیا۔ اولیور کرامویل فوج کا سربراہ تھا جس میں زیادہ تر پیوریٹن شامل تھے۔ وہ پارلیمنٹ کا بھی بڑا اہم رکن تھا جو زیادہ تر پریسبی ٹیرین لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان مذہبی اور سیاسی تفرقات کی وجہ سے تین سال تک ہارے ہوئے بادشاہ کی قسمت کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد پریسبی ٹیرین ارکان کو پارلیمنٹ سے نکال دیا گیا کیونکہ وہ بادشاہ کے حامی تھے۔ باقی پیورٹین رہ گئے۔ انھوں نے بادشاہ پر مقدمہ چلایا اور اس پر ملک کے ساتھ غداری (بھلا بادشاہ اپنے ساتھ بھی غداری کر سکتا ہے ؟) کرنے کا الزام لگا کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے بعد

پیوریٹن ارکان نے پرانا ہاؤس آف لارڈز ختم کر دیا اور صرف ہاؤس آف کامنز رہنے دیا۔ انگلستان سے شہنشاہی ختم ہو گئی اور وہ "دولت مشترکہ" کے نام سے ایک جمہوریہ بن گیا۔

اب اولیور کرامویل کی سنیئے۔ وہ بھی اپنے وقت کا جارج واشنگٹن تھا۔ واشنگٹن کی طرح وہ بہت بڑا زمیندار تھا۔ واشنگٹن کی طرح اس نے پہلے کسانوں میں اور پھر سیاسی حلقوں میں ایک لیڈر کی حیثیت اختیار کی۔ واشنگٹن کی طرح وہ ایک غیر معمولی جنرل تھا۔ وہ بھی اُسی مقصد کے لیے لڑا جس کے لئے واشنگٹن لڑا تھا یعنی کسی مطلق العنان بادشاہ کو حکومت کرنے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ عوام کے نمائندے حکومت کریں۔ بایں ہمہ ۱۶۴۹ء کے بعد کرامویل کی زندگی کا رخ بالکل بدل گیا۔

۱۶۴۹ء میں آئرلینڈ بھی خانہ جنگی میں شامل ہو گیا اور بادشاہ کی حمایت شروع کی لہٰذا کرامویل اور اس کی فوج بحیرۂ آئرلینڈ کو پار کر کے آئرلینڈ والوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئی۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے ہم وطنوں کو تمام حقوق دینے کا دعوے کرتے تھے لیکن آئرلینڈ والوں کو انھوں نے یہ رعایت نہ دی اور ان کے ساتھ ایک جابر جاگیردار جیسا سلوک کیا۔ جب آئرلینڈ کی جنگ ختم ہو گئی تو کرامویل نے چارلز دوم کی جمع کردہ فوج سے لڑنے کے لیے شمال کا رخ کیا۔ چارلز دوم کو اس کے والد کے لندن میں قتل کر دیے جانے کے بعد انڈنبرا میں بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے بعض تجارتی دشواریوں کی بنا پر ہالینڈ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور جب یہ کام ختم ہؤا تو اسپین سے لڑائی شروع ہو گئی۔

اگر اس نئی جمہوریہ میں کرامویل لڑائیوں سے گریز کرتا تو اچھا رہتا بالکل اسی طرح جیسے ایک سو تیس سال بعد نئی امریکی جمہوریہ میں جارج واشنگٹن نے کیا۔ انگلستان کو یہ لڑائیاں بڑی مہنگی پڑیں۔ جھگڑے بڑھتے گئے۔ ایک پارلیمنٹ کے بعد دوسری آتی رہی۔

کرامویل کو "محافظِ اعلیٰ"[1] کا خطاب ملا اور وہ فوج کی مدد سے حکومت کرتا رہا۔ ایک اور پارلیمنٹ برسرِ اقتدار آئی اور اس نے پھر "ہاؤس آف لارڈز" قائم کر دیا۔ ۱۶۵۸ء میں کرامویل کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا نامزد ہوا۔ انقلاب کے زمانے سے اب تک فصلیں خراب رہی تھیں۔ لوگ غریب اور خستہ تھے لہذا چارلز دوم کو تخت پیش کر دیا گیا اور انگلستان میں شہنشاہی واپس آگئی۔

یہ شخص چارلز اول سے مختلف تھا۔ انقلاب میں بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچا تھا اس کا اثر ہو کر رہا۔ چارلز دوم جانتا تھا کہ وہ اسی وقت تک انگلستان کا بادشاہ ہے جب تک پارلیمنٹ سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا سایہ نہ سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ قانون کا احترام کرنے والوں، تاجروں، کسانوں اور خدا ترس کاروباری لوگوں کی مرضی سے بادشاہ بنا ہے۔ آنے والے دور میں بادشاہ محض ایک علامتی حیثیت کا مالک بن کر رہ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکی جھنڈا ایک علامت ہے۔ جب اہلِ برطانیہ کہتے تھے "خدا بادشاہ کی حفاظت کرے"، تو ان کا مطلب بالکل وہی ہوتا تھا جو امریکیوں کا ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں "یہ جھنڈا ہمیشہ لہراتا رہے"۔

سترھویں صدی میں انگلستان کو ایک اور انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔ چارلز دوم کے مرنے پر اس کا بھائی جیمز دوم بادشاہ بنا۔ وہ کیتھولک تھا لہذا مذہبی دشواریاں پھر سامنے آئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ لوگ دوسرے مذہب والوں کو اپنا ہم مذہب بنانا چاہتے تھے خواہ طاقت ہی استعمال کرنی پڑے بلکہ مذہبی تفرقات کی بنا پر معاشرتی تفرقے بھی پیدا ہو جاتے تھے مثلاً لندن کا مزدور طبقہ پیورٹین تھا اور شمالی انگلستان کے کسان کیتھولک تھے۔ مذہب کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں پر انھیں اختلاف رہتا تھا۔ جیمز نے ملک کو دوبارہ

---

[1] Lord Protector

کیتھولک بنانے میں عجلت سے کام لیا چنانچہ اسے بہت جلد ملک بدر کر دیا گیا اور تخت پر شاہ ولیم اور ملکہ میری کا قبضہ ہو گیا۔ پس ۱۶۸۸ء کے اس نام نہاد "شاندار انقلاب"[1] نے ۱۶۴۰ء کا ایک سبق دہرایا۔ وہ اقتدار جو کسی زمانے میں بادشاہ کے ہاتھ میں تھا، اب عوام کے ہاتھ میں آگیا۔ اگر کوئی بادشاہ ان کے کہنے پر نہ چلتا تھا تو وہ اسے معزول کر دیتے تھے۔

جس زمانے میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان جھگڑے ہو رہے تھے اور اندرونِ ملک نیز بیرونِ ملک لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا، اس وقت لاکھوں عوام اپنے اپنے کام میں لگے رہے بالکل اسی طرح جیسے بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے دوران میں بہت سے لوگ ان سے بے تعلق رہے۔ اس زمانے کے طرزِ زندگی کی عکاسی ان خطوط سے ہوتی ہے جو ڈوروتھی اوسبورن نامی ایک لڑکی نے ۱۶۵۰ء کے بعد اپنے محبوب کو لکھے اور وہ ڈائری جو سیموئل پیپز نے ۱۶۵۹ء سے ۱۶۶۹ء تک لکھی۔ جو شخص بھی ڈوروتھی اوسبورن کے خطوط پڑھتا ہے، بے اختیار اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ڈوروتھی اور اس کا بھائی جزیرۂ واٹٹ میں سفر کر رہے تھے کہ ان کی ملاقات ایک خوبصورت نوجوان سے ہوئی جس کا نام سر ولیم ٹیمپل تھا۔ اس نے مذاق سے اس سرائے کی کھڑکی پر جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک سیاسی نعرہ کندہ کر دیا اور مصیبت میں پڑ گیا۔ اس زمانے میں کوئی شخص سیاسی قسم کا مذاق نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان ولیم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ جاتا۔ لیکن ڈوروتھی نے اسے بچا لیا۔ وہ جج کی کچہری میں پہنچی اور یہ الزام اپنے سر لے لیا۔ جج شریف آدمی تھا وہ کسی خاتون کو سزا نہ دے سکتا تھا اور خاتون بھی ایسی حسین جیسی ڈوروتھی۔ اب یہ تینوں افراد خوشی خوشی ساتھ رہنے لگے۔ ولیم اور ڈوروتھی کو ایک دوسرے سے بڑی محبت

---

[1] Glorious Revolution

ہو گئی، لیکن ان کی شادی ہونے میں کچھ عرصہ لگا۔ اس عرصے میں ڈرووتھی نے اپنے محبوب کو جو خطوط لکھے وہ ہجر زدہ عشاق کے لئے ہمیشہ تسکین کا سامان مہیا کرتے رہیں گے۔" گزشتہ شب میں ۱۱ بجے تک باغیچے میں رہی۔ میں نے اتنی دلفریب رات پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ باغیچہ نہایت حسین معلوم ہو رہا تھا۔ چمیلی کی خوشبو مسحور کن تھی پھر بھی مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہاں تسکین کا ہر وہ سامان موجود تھا جو پہلے تھا۔ اگر آپ بھی ساتھ ہوتے تو یہ جگہ مجھے بہت ہی زیادہ پسند آتی۔ آپ کے بغیر یہ باغیچہ بس ایک میدان معلوم ہوتا تھا۔ جس میں، مَیں آزادی سے گھوم سکتی تھی۔"

سیموئل پیپز نہ صرف اپنے وقت کا بہترین ڈائری نویس ہے بلکہ اس کی تحریروں میں اس کا اپنا کردار اور عہد دونوں خوب جھلکتے ہیں "۸ ستمبر ۱۶۶۲ء گھر پر بیوی کے ساتھ رات کا کھانا آیا۔ آج کپڑے دھونے کا دن تھا۔ ہم نے بکرے کی ران پکائی۔۔۔ ۶ جنوری ۱۶۶۳ء آج صبح میں نے ایک ایسا کام شروع کیا جس سے وقت اور رقم دونوں کی بچت ہو گی۔ میں نے استرے سے اپنی حجامت خود کی۔ جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ۲۴ ستمبر ۱۶۶۵ء۔ گھر تک چہل قدمی کی۔ لارڈ برونکر نے مجھے ایک بڑی اچھی چھڑی دی لیکن مجھے کو م فارم کی طرف سے گزرتے ہوئے بڑی کوفت ہوئی جہاں تقریباً اکیس آدمی طاعون کا شکار ہو چکے ہیں۔۔۔۔ ۲۶ اکتوبر ۱۶۶۵ء سر کرسٹوفر منگس اور میں دونوں پانی کے راستے ٹاور جا رہے ہیں۔ یہ صاحب بڑے ہوشیار اور خوش گفتار ہیں۔ انھیں اپنے والد کا پیشہ بتانے میں کوئی حجاب نہیں۔ وہ ایک موچی کے بیٹے ہیں۔۔۔۔۔ یکم دسمبر ۱۶۶۵ء میں سارے دن اپنے دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں بند رہا۔ پھر اپنے وعدے کے مطابق عیش و طرب میں حصہ لینے کے لیے گھر گیا۔ ہماری پڑوسنیں ننھی سی ٹکر اور مسز ڈینیلز رقص کرنے آئیں۔ کھانے کے بعد میں تو سونے چلے گیا۔ اور انھیں نیچے ہی کھیلتا چھوڑ آیا۔ یہ سلسلہ صبح دو تین بجے تک جاری رہا۔"

اسی صدی میں شمالی امریکا میں بھی اہم واقعات رونما ہوتے رہے۔ ۱۶۰۷ء میں جیمز ٹاؤن، ورجینیا کی نو آبادی شروع ہوئی۔ ۱۶۲۰ء میں زائرین[1] پلی متھ نامی چٹان پر اترے انھوں نے جہاز ہی پر ایک دستاویز[2] تیار کر لی تھی اور آپس میں یہ طے کیا تھا کہ وہ جمہوری طرزِ حکومت پر عامل رہیں گے۔ ان لوگوں نے اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر انگلستان میں تکلیف اٹھائی تھی۔ پیشتر اس کے کہ کرامویل کے پیوریٹین ان کے وطن پر حکومت کریں، وہ وہاں سے چلے آئے تھے لیکن وہ اپنے ساتھ ایک ایسی چیز امریکا لائے جو تمام مہذب ممالک میں سے صرف ایک ملک انھیں دے سکتا تھا اور یہ تھا جمہوری نظامِ حکومت۔ ۱۶۲۰ء میں انگلستان میں جمہوریت نہ تھی لیکن ہر ملک اسی دن سے جمہوریت کی طرف گامزن ہو گیا تھا جب ۱۲۱۵ء سے شاہ جون نے میگنا کارٹا پر دستخط کیے تھے۔ زائرین کو ساڑھے تین سو سال کا تجربہ حاصل تھا۔

ان امریکی نو آبادکاروں کے سیاسی شعور کے علاوہ ان کی یہ صفت بھی قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے وطن کا آرام چھوڑ کر ویرانوں کی تکالیف برداشت کیں۔ انگلستان کی آب و ہوا نرم اور آرام دہ ہے۔ وہاں ان لوگوں کے مکانات پختہ اینٹ یا پتھر کے تھے ان میں شاہ بلوط کی لکڑی کا عمدہ فرنیچر موجود تھا جو نسل در نسل چلا آ رہا تھا۔ گاؤں تک کی دکانوں میں خوب سامان بھرا ہوا تھا۔ کاریگر اپنے فن میں مہارت رکھتے تھے اور آپس میں اتفاق سے رہتے تھے۔ انگلستان میں کسی بھی شخص کو تمام کام آنے ضروری نہ تھے پہلے انگریز نو آبادکاروں کو لکڑی کے مکانات بنانے نہ آتے تھے کیونکہ انھوں نے انگلستان میں ایسے مکانات کبھی نہ دیکھے تھے۔ خوش قسمتی سے سویڈن کے کچھ لوگ ڈیلویئر میں پہنچ گئے۔ انگریزوں نے ان سے یہ فن سیکھا۔

۱۔ Pilgrims ۲۔ Mayflower Compact

اگلے ڈیڑھ سو سال میں ان نو آباد کاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ انھوں نے محنت کی اور باوجود مشکلات کے خوشحال رہے۔ انگلستان کے باشندے ان نو آبادیوں کو اپنے ملک کے لیے نفع کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ عرصۂ دراز تک یہ نو آبادکار اپنی مرضی کے مختار رہے۔ دقت صرف اس وقت پیش آئی جب برطانیہ نے چند وہ قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی جو عرصۂ دراز سے صرف کتابوں میں بند تھے اور کسی نے ان کی تعمیل نہ کی تھی۔ اس وقت مالی اقتدار اور اس کے ساتھ ملکی حکومت کا سوال خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ جیسا کہ سابقہ انقلاب کے وقت ہوا تھا۔ اس سوال کی اہمیت کو دونوں اطراف سے محسوس کیا گیا اور نو آبادیاتی نقطۂ نظر کے حق میں بہت کم آوازیں بلند ہوئیں۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر سے کچھ لوگ بولے ضرور مگر پارلیمنٹ کے زیادہ تر ارکان نے یہ کہا کہ نو آبادکاروں کو وہ ٹیکس ادا کرنے چاہئیں جو ان کا وطن ان پر عائد کرے۔ لیکن امریکا میں بسنے والے یہ لوگ اپنے آپ کو خود مختار سمجھتے تھے۔ امریکا میں تاریخ کی کتابیں شاہ جارج سوم کو ظالم کہہ کر پکارتی تھیں — اس زمانے میں اس کے خلاف یہی پروپیگنڈا کیا جاتا تھا — لیکن شاہِ انگلستان کے ہاتھ میں کسی قسم کے اختیارات نہ تھے۔ جارج سوم بڑا چالاک سیاستداں تھا۔ نو آبادیوں کے متعلق جو فیصلے بھی کئے گئے وہ سب پارلیمنٹ نے کیے تھے، بادشاہ نے نہیں۔

جس طرح ۱۶۴۰ء کی خانہ جنگی میں بہت سے ایسے آدمی شریک تھے جو بادشاہ کے نظریات سے تو اختلاف کرتے تھے لیکن کھل کر اس کے خلاف بغاوت نہ کر سکتے تھے، اسی طرح امریکی نو آبادیوں میں بھی بہت سے ایسے آدمی تھے جو بادشاہِ وقت کے خلاف لڑنے سے گریز کر رہے تھے۔ بنجمن فرینکلن نے لندن میں ہر شخص سے بات کی اور اس پر نو آبادیوں کا نقطۂ نظر واضح کیا۔ اس کے بعد وہ واپس آیا اور اس نے نو آبادکاروں کو لندن والوں کا نقطۂ نظر سمجھایا۔ ایک مرتبہ الیگزینڈر ہملٹن نے جو بعد میں خزانے کا پہلا امریکی سیکرٹری

بنا، ایسی تجویز پیش کی جس سے نو آبادیاں قانونی طور پر تو آزاد ہو جاتیں لیکن بادشاہ سے ان کا الحاق بدستور قایم رہتا بالکل اسی طرح جیسے کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ خودمختار ہیں مگر دولتِ مشترکہ کا حصہ ہیں۔ بالآخر جب جنگ شروع ہوئی تو ہزاروں محنتی ایماندار اور خوشحال امریکی محض اس وجہ سے کینیڈا بھاگ گئے کہ وہ اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت نہ کر سکتے تھے۔ اُن کے گھر اور جائدادیں سب کی سب ضبط ہو گئیں۔

یہاں انقلابی جنگ کی تفصیل دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد نو آبادکاروں نے قیامِ امن کے لیے جو شاندار ذرائع استعمال کئے ان کا ذکر بھی بے محل ہے۔ قبل اس کے کہ یہ کشمکش ختم ہوتی برطانیہ نے اسپین، فرانس، ہالینڈ اور باغی نو آبادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ یہ جنگ تجارتی اور سیاسی نوعیت کی تھی۔

برطانیہ اس جنگ میں ہار گیا اور اس نے اس شکست سے بہت کچھ سیکھا۔ اسے مجبوراً ان ملکوں کو آزاد کرنا پڑا اور نو آبادیوں کے سلسلے میں اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔ برطانیہ نے محسوس کیا کہ نو آبادیوں میں مقامی باشندوں کی اپنی حکومت ہونی چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا لیکن نو آبادیوں کے سلسلے میں موجودہ پالیسی کے نظریات اپنی جگہ ہیں بہترین۔

برطانیہ کے سکولوں میں جارج واشنگٹن کی تعریف و توصیف کرنے اور اس کی عزت کرنے کا سبق دیا جاتا ہے کیونکہ وہ عالمی تاریخ کا ایک ممتاز فرد تھا۔ واشنگٹن کا مجسمہ ٹرافیلگر سکوئر میں نصب ہے جو لندن کا مرکز ہے (ایک دوسرے امریکی ہیرو ابراہیم لنکن کا مجسمہ پارلیمنٹ کی عمارتوں کے قریب نصب ہے) اگرچہ بہت سے امریکیوں کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اہلِ برطانیہ امریکی انقلاب کا احترام کرتے ہیں لیکن انھیں یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوتی ہے کہ ان کے یہ انگریز دوست اس جنگ سے بالکل بے خبر ہیں جو ۱۸۱۲ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکا اور برطانیہ کے درمیان لڑی گئی تھی۔ امریکیوں کے لیے جو چیز "۱۸۱۲ء کی جنگ"

تھی، وہ اہلِ برطانیہ کے نزدیک اس جنگ کا ایک معمولی حصہ ہے جو نپولین کے خلاف لڑی گئی - اہلِ برطانیہ کو نپولین کی آخری لڑائیوں اور یورپ میں اس کی شکست سے کہیں زیادہ دلچسپی تھی، بہ نسبت اس جھگڑے کے، جو ریاست ہائے متحدہ امریکا اور کینیڈا کی درمیانی سرحد کے سلسلے میں ہوا، یا یورپ کی ناکہ بندی اور بحری سپاہیوں کی جبری بھرتی وغیرہ۔

امریکی انقلاب کے بعد ۱۷۸۹ء میں فرانس میں انقلاب برپا ہوا - انگلستان اور دوسرے ممالک فرانس میں عوامی حکومت کی تباہ کاریاں دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے تھے لیکن فرانس کے عوام کو یہ امید تھی کہ دوسرے ممالک میں بھی اسی قسم کا انقلاب رونما ہوگا۔ ان کی فوج نہ صرف اپنے دشمنوں کے خلاف لڑی بلکہ ان کے خلاف بھی، جو عوام کے دشمن تھے، خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ ان لڑائیوں کے خاتمے سے پہلے ہی نپولین نیچے سے ترقی کرتے کرتے فرانسیسی فوج کا کمانڈر انچیف اور پھر ڈکٹیٹر بن گیا۔ ۱۸۰۵ء میں برطانیہ کو اس کی طرف سے حملے کا پورا خطرہ تھا لہذا ساحل پر دفاعی انتظامات کئے گئے اور ہوم گارڈز کا قیام عمل میں آیا لیکن نپولین نے حملہ نہ کیا بلکہ ایک بازو والے بحری کپتان ہوریشیو نیلسن نے ٹرافیلگر کی جنگ میں فرانسیسی بحریہ کو شکست دی۔ خشکی پر نپولین کو روس سے لڑنا پڑا جس میں اس کی پوری فوج کام آئی۔ بالآخر ۱۸۱۵ء میں نپولین نے واٹرلو میں شکست کھائی۔ برطانیہ نے اسے جنوبی بحر اطلانٹک کے جزیرے سینٹ ہلینا میں قید کر دیا جہاں چھ سال کے بعد ۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بارھواں باب

انیسویں اور بیسویں صدی

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہزاروں سال تک انسان کی غذا حاصل کرنے کے طریقے، پوشاک اور مکانات کا طرز تقریباً ایک جیسا رہا لیکن پھر ایک صدی سے بھی کم عرصے میں یہ سب کچھ بدل گیا اور ایجادات کا دور آ گیا؟ آخر کیا بات تھی کہ بہترین فنکار اور نہایت ذہین آدمی بھی اپنے کپڑے، اپنا گھریلو ساز و سامان اور سامان فروخت اپنے ہی ہاتھوں سے تیار کرتے رہے؟ موجودہ کارخانے قدیم یونانی یا رومن باشندوں نے کیوں نہ ایجاد کئے؟ کیا وجہ ہے کہ زراعت کی ایجاد، جس نے انسان کو خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات دلا کر ایک جگہ رہنا سکھایا اور جدید مشینری کی ایجاد کے درمیان اتنا طویل عرصہ حائل ہے؟ مشینوں کی ایجاد "صنعتی انقلاب" کا سبب بنی۔

ان سوالات کا جواب نہایت اختصار کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک دنیا میں بہت سی چیزوں کی ایک ساتھ ضرورت نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو اس کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کے پاس اتنی دولت نہ تھی۔ اگر آپ کوئی کارخانہ قائم کرنا چاہیں تو آپ کو سرمائے کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کو ایک زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل کرنے پر زرِ کثیر صرف ہوا ہو گا۔ صنعتی انقلاب انگلستان میں شروع ہوا۔ اور انگلستان نے موجودہ صنعتی نظام ایجاد کیا کیونکہ انگلستان کو اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ابتدا میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑی۔ جدید صنعتی نظام کی ترقی کے لیے اس کے پاس کافی دولت تھی۔

صنعتی انقلاب کا مطلب یہ تھا کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک قوم کو خود مکتفی ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ گرم مسالے اور ریشم جیسے سامانِ تعیش کے سوا لوگ ضرورت کی تمام اشیاء اپنے وطن میں خود پیدا کر لیا کرتے تھے۔ دیہات اور شہروں میں ہر قسم کے کاریگر موجود ہوتے تھے ــــ نانبائی جو مقامی اناج سے روٹی تیار کرتے تھے۔ یہ اناج ایک اور شخص پیس کر ان کے حوالے کر دیتا تھا۔ موچی اور زین ساز دیسی چمڑا استعمال کرتے تھے۔ کچھ لوگ اون کاتتے تھے اور کچھ اس سے کپڑا تیار کرتے تھے۔ مقامی بڑھئی گاڑیوں کے پہیے اور گاڑیاں بنا دیتے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے گھروں یا دکانوں میں کام کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک دو مویشی ہوتے تھے اور باغیچے میں ضرورت کی ترکاریاں پیدا ہو جاتی تھیں اب لوگوں نے گھروں پر کام کرنا چھوڑ دیا۔ دستکاریاں ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ کارخانے کھڑے ہو گئے۔ بہت سے لوگ ایک جگہ رہنے لگے اور سب کے سب مل کر ایک ہی قسم کی چیزیں تیار کرنے لگے۔ اس سے قبل ہر شخص اپنا مالک ہوتا تھا اور اب ہزاروں آدمی مل کر ایک مالک کے لیے کام کرنے لگے جو انھیں نظر بھی نہ آتا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی سب سے پہلے کسانوں میں شروع ہوئی۔ انسان کی پوری تاریخ غربت و افلاس سے آلودہ ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا، بہت سے بچے کم سنی ہی میں مر گئے اور صرف کچھ لوگ عمر طبیعی کو پہنچے۔ لیکن جب انگلستان کے کسانوں نے اپنی فصلیں باری باری بونی شروع کیں اور زراعت کے نئے طریقے اختیار کئے تو انھیں پیٹ بھر کھانا ملنے لگا۔ کم بچے موت کا شکار ہوئے، بیماریاں کم ہو گئیں اور آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑے کی مانگ یکایک بڑھ گئی جو صرف ہاتھ سے بن کر پوری نہ ہو سکتی تھی۔ برطانیہ کا مال جہازوں پر لد کر دوسرے ملکوں کو جانے لگا۔ برآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح تاجروں نے بڑا نفع کمایا۔ ان میں سے بہتوں نے زمینیں خریدیں اور اپنے لیے دیہی قیام گاہیں تعمیر کیں لیکن یہ سب

کچھ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس رقم بچ رہتی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہاں خرچ کریں۔ اس وقت تک سیونگ بینک شروع نہ ہوئے تھے۔ سرمایہ کاری کے دوسرے طریقے بھی محدود تھے کیونکہ خرید و فروخت کی اشیاء تھوڑی تھیں۔ ان تمام چیزوں کا معاشرتی ترقی پر پورا اثر پڑا۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور ان کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ سازوسامان کی ضرورت پڑی۔ فوجوں نے خاص وردیاں استعمال کرنی شروع کر دیں اور معیاری ہتھیاروں سے کام لینے لگیں۔ اب ضرورت کسی ایسے طریقے کی تھی جس سے بہت سی چیزیں تیزی سے تیار ہونے لگیں تاکہ انگلستان نیز دوسرے ممالک کی ضرورت پوری ہو سکے۔ ساتھ ہی ساتھ دولت مند لوگوں کو یہ خواہش بھی ہوئی کہ وہ اپنا سرمایہ کسی اچھی جگہ لگائیں۔

برطانیہ میں بہت سے لوگوں کو اس بات کا احساس ہوا اور انھوں نے نئی مشینیں ایجاد کرنے کی فکر کی۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید کی زیادہ تر مشینیں انگلستان میں بنیں مثلاً جیمز واٹ نے سٹیم انجن، ٹریوی تھک نے لوکوموٹو، سرچارلز، پارسنز نے سٹیم ٹربائن کے نے شٹل نلی، ہارگریوز نے کرگھا اور کارٹ رائٹ نے کپڑا بننے کی مشین ایجاد کی کوئلے کی مدد سے لوہے کو پگھلانے کے طریقے انگلستان ہی میں تکمیل کو پہنچے۔ زیادہ مال تیار ہونے لگا تو بہتر ذرائع رسل و رسائل کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ انجنیروں نے نہریں کھودنے کی مشینیں ایجاد کیں، سڑکیں تعمیر ہوئیں، ریل اور پل تیار ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب چارلز ڈکنز اور دوسرے انگریز ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہنچے تو انھیں وہاں کی ابتدائی سڑکیں بالکل پسند نہ آئیں کیونکہ وہ انگلستان کی عمدہ سڑکوں کے عادی تھے۔ جب ایک امریکی شخص رابرٹ فلٹن نے دخانی جہاز ایجاد کیا تو برطانوی ملاحوں نے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا۔ جلد ہی برطانوی جہازوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ کل جہازوں کی تین چوتھائی تعداد برطانیہ سے تعلق رکھتی تھی اور تمام دخانی جہازوں میں $\frac{9}{10}$ ان کے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان میں صرف ایک ہی دن میں "میکانیات" کا شعور

پیدا ہو گیا ہے ۔ وہاں کے لوگ ہر نئے خیال کو عملی جامہ پہنانے لگے ۔

کارخانوں کی تعداد سیکڑوں اور ہزاروں تک پہنچ گئی جو انگلستان کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں میں واقع تھے ۔ نئے شہر آباد ہوئے ۔ جہاز "ساختہ برطانیہ" مال لے کر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگے اور چونکہ انگلستان میں غذائی پیداوار کم ہوگئی تھی اس لیے ضرورت کا غلّہ باہر سے درآمد کیا جانے لگا ۔ برطانیہ کا چھوٹا سا جزیرہ دنیا کا عظیم صنعتی مرکز بن گیا اور چونکہ وہ اس میدان میں سب سے آگے تھا اس لیے اس کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہوا لیکن برطانیہ کو یہ دولت یا عزت یونہی حاصل نہ ہوئی ۔ نئے کارخانوں میں کام کرنے والوں کو یہ کام بڑا مہنگا پڑا ۔

چونکہ انگلستان پہلا صنعتی ملک تھا اس لئے اس سے بھی وہ تمام غلطیاں سرزد ہوئیں جو کوئی نیا کام شروع کرتے وقت دوسرے لوگوں سے ہوتی ہیں ۔ کسانوں کو صبح سے رات تک کام کرنے کی عادت تھی ۔ اس لیے نئے کارخانے داروں نے یہاں بھی اُن سے اتنا ہی کام لیا ۔ وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ کھیتوں پر کام کرنا اور بات ہے ۔ وہاں کھلی ہوا ہوتی ہے اور کسان بیچ بیچ میں آرام کرتا رہتا ہے ۔ کارخانوں کے گرد آلود اور دھوئیں دار ماحول میں پورے سولہ گھنٹے کام کرنا ممکن نہیں اسی طرح بچّے بھی کارخانوں میں کام کرنے لگے ۔ لڑکیاں گھروں کے اندر کاتنے ، بننے اور سینے پرونے میں ہاتھ بٹانے لگیں اور لڑکے کارخانوں میں جانے لگے اور نہ کارخانہ داروں کو یہ احساس ہوا اور نہ والدین کو کہ ایک دس سالہ لڑکی سے گھر میں کاتنے بننے کا کام لینے اور پھر اپنی عمر کے بچے کو پورے بارہ گھنٹے کے لیے کسی کان یا کارخانے میں بند کر دینے میں کتنا زبردست فرق ہے ۔ کارخانوں کی ابتدا ہوئی تو ہزاروں بچوں کو اس قسم کے حالات کا سامنا ہوا ۔ کارخانہ داروں کو ان کی ضرورت اس لیے تھی کہ انھیں بڑوں سے کم اجرت دینی پڑتی تھی (برطانیہ میں یہ لعنت ابھی تک موجود ہے) اور والدین ان کو اس لیے کام کرنے پر

مجبور کرتے تھے کہ تنہا ان کی مزدوری پورے گھر کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزدوروں نے ٹریڈ یونینیں قائم کیں۔ ضرورت کے مطابق انھوں نے بار بار ہڑتالیں بھی کیں اور اپنے مالکوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اُن سے کم کام لیں اور بہتر مزدوری ادا کریں۔ سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا کہ پہلا فیکٹری ایکٹ منظور ہوا جس کی رو سے بچوں اور عورتوں سے دس گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام لینا ممنوع قرار پایا ــــــ بعد میں مرد بھی صرف دس گھنٹے روزانہ کام کرنے لگے۔ لیکن عورتوں اور بچوں کو کوئلے کی کانوں میں کام کرنے کی اب بھی اجازت تھی۔ چھوٹے لڑکوں سے چمنی صاف کرنے کا کام ۱۸۷۵ء تک لیا جاتا رہا۔ جو لوگ اِس قسم کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے، وہ بدمعاش کہلاتے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں غریبوں کی امداد کے لیے انگلستان میں بہت سے خیراتی ادارے قایم ہوئے مثلاً سالویشن آرمی، وائی ایم سی اے اور وائی ڈبلیو سی اے وغیرہ۔ زیادہ تر لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ خدا ہر شخص سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اسی حالت میں رہے جس میں اسے پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً اگر کسی کان کن کا بیٹا کان میں جانے سے انکار کرتا ہے تو وہ خدا کی حکم عدولی کر رہا ہے۔ چاہے کان میں اسے کتنی بھی تکلیف ہو اسے یہی کام کرنا چاہیئے۔

اس کے باوجود بہت سے لوگ کارخانوں کی لعنت سے بچنے کے لیے ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ چونکہ برطانیہ ایک جزیرہ ہے اس لیے وہ امریکیوں کی طرح ملکی سرحدوں کے اندر نہ رہ سکے۔ کسی نے کہا ہے کہ امریکیوں نے اپنی "سلطنت" ایک دریا (مسی سپی) کے پار قائم کی لیکن اہلِ برطانیہ کو سمندر پار جانا پڑا۔ امریکا کے جو لوگ مقامی حالات سے مطمئن نہ تھے۔ وہ مغرب کی جانب ہجرت کر کے کیلی فورنیا پہنچ گئے لیکن برطانیہ کے لوگ کینیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکا تک پہنچے۔ جو لوگ مغربی افریقہ میں متمکن ہوئے ان میں تاریخ کے چند بہترین اور بدترین کردار کے لوگ شامل تھے۔

برطانوی سلطنت بھی، ایسے ہی لوگوں نے، تقریباً ایسے ہی اسباب کی بنا پر قائم کی۔

جو لوگ انگلستان کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے یا چھوڑ نہ سکے انھوں نے انیسویں صدی میں کچھ بہتری دیکھی اگرچہ اس کی رفتار سست تھی۔ یہ سچ ہے کہ جب امریکی اناج بہت زیادہ مقدار میں ایک ساتھ بازار میں پہنچا — تو کسانوں کو تکلیف ہوئی کیونکہ اس کا بھاؤ دیسی گیہوں سے کم تھا۔ اس وقت سے اب تک کسانوں کی حالت خراب ہی رہی ہے سوائے ان چند برسوں کے، جب جنگ جاری رہی۔ ایک آفت اور آئی جس کا اثر لنکا شائر کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں پر پڑا۔ امریکی خانہ جنگی کے زمانے میں کپاس آنی بند ہو گئی تو یہ کارخانے بھی بند ہو گئے۔ بعد میں مصر میں کچھ کپاس کاشت کی گئی۔ لیکن اس وقت تک بہت سے مزدور بھوکوں مر گئے۔ اس قسم کے مقامی مسائل اور بے روزگاری کے باوجود انیسویں صدی میں لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہوتا رہا۔

امریکی جنگ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۵ء کے متعلق انگلستان میں اختلافِ رائے تھا۔ امراء عام طور پر جنوبی حصے کے حامی تھے ان میں وہ بڑے بڑے زمیندار شامل تھے جن کا امریکی کسانوں کے ساتھ دوستانہ تھا یا سوتی کارخانوں کے مالک تھے جو ان کسانوں کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے عوام اس جنگ کو محض جمہوری سمجھتے تھے اور شمالی حصے کی حمایت کرتے تھے۔

امریکی جنگ شروع ہونے سے بہت قبل انگلستان نے غلاموں کے متعلق ایک پالیسی وضع کر لی تھی۔ برطانیہ میں نورمن عہد ہی میں غلام رکھنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں برطانوی سلطنت میں بہت سے غلام موجود تھے۔ ولیم ولبر فورس نامی ایک شخص کی سرکردگی میں ۱۸۳۳ء میں یہ تمام غلام آزاد کر دیے گئے اور ان کے مالکوں کو مناسب معاوضہ ادا کیا گیا جس کا تخمینہ دو کروڑ پونڈ تھا۔ یہ رقم برطانیہ کے ٹیکس دینے والوں نے ادا کی حالانکہ یہ غلام زیادہ تر جزائر غرب الہند میں تھے۔

ایک طرف تو اہل برطانیہ غلامی کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے چاہے اس کے لیے انھیں جیب سے کچھ دینا پڑے اور دوسری طرف انھیں جنوبی امریکا کے باشندوں سے بھی ہمدردی تھی جو جنگ آزادی میں مصروف تھے۔ اہل برطانیہ کی خاصی تعداد بولیور اور سان مارٹن کی مدد کے لیے وہاں پہنچی تاکہ ہسپانوی اقتدار کو ختم کیا جائے، اس کے باوجود خود برطانیہ میں جمہوریت اپنی اصلی حالت میں موجود نہ تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ملک پر کسی موروثی بادشاہ کے بجائے ایک نمائندہ پارلیمنٹ کی حکومت تھی لیکن رائے دینے کا حق بہت کم لوگوں کو حاصل تھا۔ عورتیں تو ۱۹۱۸ء سے پہلے ووٹ دے ہی نہ سکی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں بھی صرف وہ مرد ووٹ دے سکتے تھے جن کے پاس خاصی جائداد ہوتی تھی۔ بایں ہمہ پارلیمنٹ پوری نمائندگی نہ کرتی تھی۔ تبدیل آبادی کے پیشِ نظر اس میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد بہت سے بڑے شہروں کی آبادی کم ہو گئی تھی، پھر بھی وہ ہاؤس آف کامنز میں دو دو نمائندے بھیج سکتے تھے۔ لبعض زرعی اضلاع میں کئی بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے تھے۔ لیکن وہ پارلیمنٹ میں اپنا کوئی نمائندہ نہ بھیج سکتے تھے۔

یہ بات نامناسب اور غیر جمہوری تھی۔ کسانوں کے نمائندوں نے پارلیمنٹ کی اصلاح کے لیے ایک بل پاس کرانے کی بڑی کوشش کی جس سے سارے ملک میں کئی سال تک بڑا ہنگامہ برپا رہا۔ بالآخر یہ اصلاحی بل ۱۸۳۲ء میں پاس ہو گیا۔ غیر آباد حصوں کی نمائندگی ختم ہو گئی۔ انھیں بڑے اضلاع میں مدغم کر دیا گیا اور نئے شہروں کو مناسب نمائندگی دی گئی۔ جائداد کی شرط نرم کر دی گئی تاکہ زیادہ لوگ ووٹ دے سکیں اور بعد میں یہ شرط بالکل ختم کر دی گئی۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو تنخواہ دی جانے لگی۔ ماضی میں ان سے بغیر تنخواہ .... کام لیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رشوتیں لینے لگے تھے ورنہ ان کا خرچ کیسے چلتا۔

۱۸۳۷ء میں وکٹوریا کا طویل دورِ حکومت شروع ہوا۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ملکہ بن گئی تھیں۔ انھوں نے اپنی ڈائمنڈ جوبلی یعنی ساٹھویں سالگرہ تخت ہی پر منائی۔ وہ ملکہ ضرور تھیں لیکن الزبتھ کی طرح مطلق العنان نہ تھیں۔ وہ بہت کچھ اپنے پیشرو جیسی تھیں پھر بھی ان کا عہد "دورِ وکٹوریا" کے نام سے ابھی تک یاد کیا جاتا ہے ان کی اپنی مثال سے اہل برطانیہ (اور کسی حد تک اہل امریکا بھی) سنجیدہ مزاج، باعزت، کفایت شعار، اور پاکباز ہو گئے۔ اس زمانے میں انوار کو دنیا کی کوئی قوم اتنی شادمان نہ ہوتی تھی جتنے انگریز ہوتے تھے۔

سوائے ادب کے، وکٹوریا عہد میں متانت اس قدر بڑھی کہ بدمذاقی کی حد تک پہنچ گئی۔ اس کی وجہ آپ کو اس زمانے کے طرزِ تعمیر کو دیکھ کر معلوم ہو سکتی ہے جب ملکہ وکٹوریا تخت نشین ہوئیں تو معمار پرانے طرز ہی پر کام کر رہے تھے۔ اُن کے بنائے ہوئے مکانات ابھی تک خوبصورت ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مکانات بنانے اور سڑکیں وغیرہ تعمیر کرنے کے فن میں اٹھارویں صدی کے معماروں نے کمال حاصل کر لیا تھا لیکن عہدِ وکٹوریا کے وسط میں ان ماہرین نے تمام پرانے قاعدے قوانین ختم کر دیئے اور مکانات کی تعمیر یونانی مندروں، چینی پگوڈوں یا دونوں کے ملے جلے طرز پر شروع کر دی۔ زیوروں سے آراستہ عورت کی طرح، وکٹوریائی مکان میں گوتھک مینار، گنبد، نقش ونگار رنگین ٹائل اور شیشے کی پچی کاری ہوتی تھی۔ مکان جتنا کم قیمت ہوتا تھا، اُس کا سامانِ آرائش بھی اُتنا ہی سستا ہوتا تھا۔ انگلستان کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس لیے انگلستان کے محلے بھدّے مکانات سے پُر ہو گئے جو نہایت تیزی سے تعمیر کیے گئے تھے (اسی طرح امریکا میں بہت سے نئے شہر تعمیر ہوئے۔ ان پر بھی یہی اثر غالب تھا)

انگلستان کے بعض اضلاع نہایت گندے ہو گئے۔ بعض کا وقار بدستور قائم

رہا اگرچہ ان کا حسن بھی جاتا رہا تھا۔ حکومت گندے محلوں کی صفائی اور نئے مکانات تعمیر کرنے کے منصوبوں پر غور کر رہی تھی کہ دوسری جنگِ عظیم آ گئی اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں وہ تمام نئے محلے اور نئے مکانات بمباری سے تباہ ہو گئے جن میں کم آمدنی والے خاندان دو تین ڈالر فی ہفتہ کرایہ ادا کر کے آرام سے رہ سکتے تھے۔ اس سے بڑی تباہی مچی لیکن ساتھ ہی ساتھ وکٹوریائی عہد کے مکانات بھی میلوں تک صاف ہو گئے جنھیں اب سے بہت پہلے مسمار کر دینا چاہیئے تھا۔ انگلستان میں برسوں مکانات کی قلت رہی لوگوں نے عارضی قیام گاہوں میں کسی صورت گذارہ کیا لیکن ایک فائدہ ہوا۔ اس طرح کم از کم سو سال پہلے کا حسن انگلستان کے صنعتی شہروں میں واپس لوٹ آیا۔

وکٹوریا کے دورِ حکومت میں برطانیہ کو روس کے خلاف کریمین جنگ (۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۶ء) اور ولندیزیوں کے خلاف بوئر جنگ (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۲ء) لڑنی پڑی۔ یہ ولندیزی جنوبی افریقہ میں آباد ہوئے تھے۔ کریمین جنگ دو باتوں کی وجہ سے آج تک یادگار ہے —— ایک یہ کہ یہ پہلی لڑائی تھی جس میں ایک اخباری نمائندے نے تاربرقی کے ذریعے سے میدانِ جنگ کے تمام حالات اپنے دفتر کو بھیجے اور لطف یہ کہ اس کا کوئی پیغام راستے میں سنسر نہ ہوا۔ یہ اپنی قسم کی آخری مثال تھی۔ دوسرے اس جنگ میں فلورنس نائٹ انگیل کا عدیم المثال استقلال معقول طبی امداد کا سبب بنا۔ پہلی مرتبہ عورتوں کے لیے نرسنگ ایک مہارت طلب اور معزز پیشہ بنا۔

برطانیہ کے بہت سے لوگ اصولی طور پر جنگِ بوئر کے خلاف تھے کیونکہ وہ حصولِ مملکت کے لیے لڑی جا رہی تھی۔ برطانیہ اس جنگ میں فتح یاب رہا لیکن اپنی بے انصافی کی تلافی کرنے کے لیے اُس نے چار سال کے بعد جنوبی افریقہ کی یونین کو مکمل آزادی دے دی۔ اس منصفانہ اقدام کی وجہ سے بوئروں کے سردار اور خاص طور سے جان سمٹس نامی عظیم مدبر برطانیہ کا وفادار دوست ہو گیا۔ ان لوگوں نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء

کی دو تو جنگوں میں برطانیہ کی مدد کی۔

اب تک سب سے بڑی اور سب سے مہنگی جنگ امریکا کی خانہ جنگی تھی لیکن جب سنہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو یورپ پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ جرمنی زیادہ قوت حاصل کرنے کی ایک کوشش کر ہی چکا تھا۔ اس نے الساس۔ لورین پر قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس اور دوسرے یورپی ممالک اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف تھے۔ برطانیہ کو یہ اندیشہ تھا کہ جرمنی سمندر پر اتنا غلبہ حاصل نہ کرے کہ اس کا بحری اقتدار خطرے میں پڑ جائے۔ اہلِ برطانیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی حیات کا دارو مدار سمندر پار تجارت پر ہے۔ ان کے ہاں ضرورت بھر پورا غلّہ بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انھیں اس کی بہت سی مقدار ریاست ہائے متحدہ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، ارجن ٹائن، جزائر غرب الہند، ملایا اور براعظم یورپ سے درآمد کرنی پڑتی تھی۔ غذا اور دوسرے درآمدی سامان کی قیمت ادا کرنے کے لیے انھیں اپنی مصنوعات برآمد کرنی پڑتی تھیں۔ ان کے جہاز دنیا کے بہت سے ملکوں کے درمیان رسل و رسائل کا اہم ذریعہ تھے ان کے بنک تھے اور وہ دوسرے ممالک کو قرض بھی دیتے تھے۔ برطانیہ کے بحری اقتدار کا خاتمہ اِن تمام چیزوں کے خاتمے کے مترادف تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل برطانیہ نے جنگ سے پہلے چند برسوں میں اپنی غیر ملکی پالیسی میں غلطیوں کا ارتکاب کیا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ غیر معمولی دانشمندی سے بھی کام لیتے تو جنگ ملتوی ہو جاتی لیکن رک نہ سکتی تھی کیونکہ جرمنی زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ برطانیہ اور دوسرے اتحادی ممالک کو اپنی حفاظت کرنی پڑی۔ جب جرمنی نے بغیر کسی انتباہ کے بلجیم پر حملہ کر دیا تو اہلِ برطانیہ کو صدمہ ہوا اور ان کی ہمدردیاں بلجیم والوں کے ساتھ ہو گئیں۔ سمجھ دار لوگوں کو ایک اور وجہ سے بھی تردّد ہوا۔ بلجیم فتح کر لینے کے بعد جرمنی کو رود بارِ انگلستان کا ساحل مل جائے گا اور اس

طرح برطانیہ کی جہاز رانی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ بلجیم کی بقا تو خطرے میں تھی ہی، برطانیہ کی بھی خیر نہ تھی۔ پس اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔

پچیس سال بعد جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تب بھی انگلستان کو پہلی جنگ کے اثرات سے نجات نہ مل سکی تھی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کے عرصے میں یہ جزیرہ جس کی آبادی ۵،۰۰۰،۰۰۰ ،۳۶ تھی ۷۵۰،۰۰۰ افراد سے محروم ہو گیا۔ یہ سب موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ (اسی جنگ میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے جس کی آبادی ۹۸،۰۰۰،۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی، ۵۰،۰۰۰ آدمی کام آئے) لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کے لیڈر یا تو بہت بوڑھے تھے یا نوجوان۔ ادھیڑ عمر کے لوگ بہت کم تھے جن کے پاس قوت اور تجربہ دونوں ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لیڈر رخصت ہو چکے تھے اور کسی گوشۂ عافیت میں محوِ آرام تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کی عمر چالیس سے زیادہ ہوتی اور ملک کو ان سے فائدہ پہنچتا۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں کی تعداد بھی تھوڑی ہی تھی۔ دس لاکھ عورتوں کی شادی نہ ہو سکی تھی کیونکہ مردوں کا قحط تھا لہٰذا بچے پیدا ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے چار سالہ مصیبت ناک دور کی یاد ہر گھرانے کے دل میں تازہ تھی۔ ہر محلے میں بچے کھچے سپاہی لنگڑاتے نظر آتے تھے۔ زمانۂ امن کے غبارے ان غباروں کی یاد دلاتے تھے جنھوں نے پہلے ہوائی حملے میں لندن پر بم برسائے تھے۔ ملک نے اُس عرصے میں جو قرضے لیے تھے ان کا سود ادا کرنے کے لیے عوام پر ٹیکس بڑھا دیے گئے تھے جو ابھی تک جاری تھے۔

برطانیہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ غریب تھا۔ اس نے بعض یورپی ممالک کو بہت سا قرضہ دیا تاکہ وہ جنگ کے اخراجات برداشت کر سکیں لیکن بعد میں اسے خود ریاست ہائے متحدہ امریکا سے قرض لینا پڑا۔ اگر یورپی ممالک برطانیہ سے لیا ہوا قرض واپس کر دیتے تو وہ امریکا کا قرض آسانی سے ادا کر دیتا لیکن یہ ممالک برباد ہو

چکے تھے، ان کے آدمی مارے جا چکے تھے لہٰذا وہ ادائگی نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ برطانیہ بھی اپنا قرض ادا نہ کر سکا۔ عوام کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ چاہتے تھے کہ خواہ کچھ بھی ہو ملک قرض سے آزاد ہو جائے لیکن خود ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں جو لوگ برسرِ روزگار تھے انھیں مشکل سے بارہ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ملتی تھی جس سے وہ اپنے بال بچے پال رہے تھے اور جو لوگ بے روزگار تھے ان کا کہنا ہی کیا۔ وہ بیچارے خود حکومت سے کچھ الاؤنس لیتے تھے۔ ان کے بچوں کے لیے پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا مشکل تھا۔

جب جرمنی دوسری جنگ پر آمادہ نظر آیا تو اہل برطانیہ نے لڑنا نہ چاہا۔ وہ جنگ کی قیمت جانتے تھے۔ پچھلی جنگ کے خاتمے سے اب تک بیس سال نہایت سختی کے گذرے تھے۔ دوسری جنگ کا مطلب یہ تھا کہ ان کے اور آدمی کام آئیں گے گھر تباہ ہوں گے۔ بچے مریں گے۔ صحت، دولت، خوشی غرض کہ ہر چیز بھینٹ چڑھ جائے گی۔ جب منچوریا میں جنگ چھڑی تو انھوں نے کہا "ہم نہیں لڑیں گے" جب اٹلی نے حبش پر حملہ کیا تو انھوں نے کہا "ہم نہیں لڑیں گے" اگرچہ اُس وقت ان میں سے بہت لوگ کافی متردّد تھے۔ جب ہٹلر نے آسٹریا اور چیکوسلوکیا پر قبضہ کر لیا۔ تب بھی انھوں نے یہی کہا "ہم لڑنا نہیں چاہتے" لیکن ان الفاظ کے باوجود وہ یہ جانتے تھے کہ لڑائی آ رہی ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ لڑیں گے خواہ لڑائی کتنی بھی مہنگی پڑے۔ وہ اس لیے لڑنے پر آمادہ تھے کہ وہ نازیوں کے غلام ہونا نہ چاہتے تھے، خواہ وہ مر جائیں، اپاہج ہو جائیں یا غریب ہو جائیں۔ آخری وقت انھوں نے جنگ کی تیاری شروع کی اور جب ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا جس کی آزادی کی ذمّہ داری برطانیہ نے چند ہی ماہ قبل قبول

کی تھی۔ تو برطانیہ نے اپنا وعدہ نبا ہا اور جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا
اس کے عوام کی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

تیرھواں باب

جنگ اور اُس کے بعد کا زمانہ

برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر نیول چیمبرلین نے تھکی ہوئی رنجیدہ آواز سے ریڈیو پر اعلان کیا کہ جرمنی سے لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ اس کے صرف نصف گھنٹے بعد انگلستان کے جنوب میں ایک سائرن نے ہوائی حملے کی اطلاع دی۔ لاکھوں آدمی جنگ کا مفہوم سمجھ گئے۔ اتوار تھا، گھروں میں رات کا کھانا پک رہا تھا۔ سب نے جلدی جلدی گیس بند کی، اپنی اپنی رقم اور نجی کاغذ سنبھالے اور لندن پر گرنے والے پہلے بم کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ بچوں کو دیہات کے محفوظ علاقوں میں بھیجنے کی مہلت بھی نہ مل سکی تھی۔ اکثر لوگوں کے پاس ہوائی حملوں سے بچنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ماؤں نے اپنے شیرخوار بچوں کو زینے کے نیچے کپڑے رکھنے کے تاریک گوشے میں پھینک دیا، لیکن ان کے سامنے پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ ان کے کان برابر ہوائی جہازوں کی آواز پر لگے رہے" رتھ اور پیٹی۔ اب ہم ایک نیا کھیل شروع کرتے ہیں۔ جب تک پولس کا سپاہی سیٹی نہیں بجاتا ہم اسی زینے کے نیچے ٹھہرے رہیں گے اور ایک گانا گاتے رہیں گے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ماں گانا شروع کرے؟"

ستمبر کے اس روشن اتوار کو خیریت رہی۔ بمباری نہیں ہوئی۔ بمباری ایک سال بعد ہوئی، جب مغربی یورپ میں برطانیہ تن تنہا دشمن کے خلاف لڑ رہا تھا۔ نازی فوجوں نے پولینڈ، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم، ناروے اور فرانس کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا تھا۔ مسولینی کا اٹلی بھی جنگ میں شریک ہو گیا۔ سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ، آئرلینڈ اور

پرتگالی غیر جانبدار رہے۔ اسپین بھی بظاہر غیر جانبدار تھا۔ لیکن اصل میں فاشسٹ تھا روس اور جرمنی کے درمیان امن کا معاہدہ تھا، لیکن ہٹلر اُسے توڑنے پر آمادہ تھا، اس لیے روس بھی اپنے دفاع کی تیاری کر رہا تھا۔ برطانوی مملکتیں اسلحہ سازی اور اپنی فوجوں کی تربیت میں مصروف تھیں۔ برطانیہ کی طرح وہ بھی بغیر تیاری کے جنگ میں شریک ہو گئی تھیں۔ امریکا ابھی خاموش تھا البتہ کبھی کبھی چیخ کر یہ کہہ دیتا تھا "آؤ برطانیہ چلیں!" مشرق میں چین پیچھے ہٹ گیا تھا اور پھر لڑنے کے لیے تیار تھا۔ جاپان کے ارادے ابھی دنیا پر ظاہر نہ ہوئے تھے کہ وہ بھی جمہوریت کے خلاف ہے۔

برطانیہ پیچھے نہ ہٹ سکتا تھا۔ فرانس کی شکست کے بعد اب وہ جرمنی کی طرف سے حملے کا منتظر تھا۔ اگر بدترین وقت بھی آیا اور لندن فتح ہو گیا تو بچی کھچی حکومت کینیڈا چلی جائے گی اور وہاں سے پھر ایک بار لڑائی کی کوشش کرے گی۔ اگر برطانیہ ہار جاتا تو یورپ پر اسی وقت حملہ ہو سکتا تھا جب کہ پہلے وطن پر قبضہ کیا جاتا۔ برطانیہ کے عوام کے لیے کوئی جائے فرار نہ تھی ـــــ کوئی ایسا ملک نہ تھا۔ جہاں یہ لوگ سمندر یا ہوا کے راستے منتقل ہو سکتے۔ ہزاروں ولندیزی، بلجین اور ناروبجین لوگ پناہ کی تلاش میں خود برطانیہ آرہے تھے۔ برطانیہ کا ہر شخص پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پریشانی سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا اور وہ تھا دفاع۔

پس پورا ملک اپنے دفاع کے لیے تیار ہو گیا لیکن ہتھیار ناکافی تھے۔ ہوم گارڈ کے ارکان کے پاس معمولی بندوقیں تھیں جو صرف خرگوش کے شکار کے لیے استعمال کی جا سکتی تھیں۔ جب تک امریکا نے کثیر تعداد میں ریوالور اور رائفلیں نہ بھیجیں انگلستان کے ساحلوں کی حفاظت لکڑی کی رائفلوں سے کی گئی۔ جرمن ٹینکوں کو روکنے کا کوئی طریقہ نہ تھا لہٰذا لڑکے اور بڑے بوڑھے کسی خندق یا باڑ میں چھپ کر ان کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جیسے ہی کوئی ٹینک قریب آتا تھا وہ لوہے کا ایک ڈنبل اس کے

پہیئے اور زنجیر کے درمیان پھینک دیتے تھے۔ عورتوں نے دودھ اور سرکے کی خالی بوتلوں میں گیولین بھر کر دیسی طرز کے دستی بم تیار کیے۔ سڑکوں پر سے تمام نشانات ہٹا دیے گئے، تمام شہروں کے نام غائب کر دیے گئے اور چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی یہ سمجھا دیا گیا کہ اگر کوئی اجنبی اس سے لندن کا راستہ پوچھے تو صرف یہ جواب دے "مجھے معلوم نہیں"۔ ہر شخص جانتا تھا کہ خود مرنے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ ایک ٹینک روک سکتا ہے یا سرکے کی ایک بوتل دشمن پر پھینک سکتا ہے، لیکن حوصلے بلند تھے۔ ہر شخص جان دینے سے پہلے اپنا فرض ادا کرنے پر تلا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ان تمام کوششوں کا نتیجہ جرمنی کی شکست اور برطانیہ کی فتح کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

اس اثناء میں برطانیہ، سمندر پر برابر لڑتا رہا کیونکہ وہ اس نازک وقت میں بھی اپنی سرحدوں کے اندر رہ کر دشمن کو شکست نہ دے سکتا تھا۔ اہلِ برطانیہ کے دو دشمن تھے ـــــ نازی اور بھوک۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ملک میں صرف تین ہفتے کی غذا باقی رہ گئی۔ اگر مزید زمین زیرِ کاشت لائی جاتی جب بھی بیج تو باہر سے ہی منگانا پڑتا۔ غذا کے علاوہ اسلحہ اور خام مال دولتِ مشترکہ کے دوسرے ممالک، امریکا اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی نوآبادیوں سے آتا تھا۔ ان کا دفاع بھی برطانیہ کی ذمہ داری بن گیا۔

بلجیم اور فرانس کی شکست کے بعد برطانوی فوج وہیں پھنس کر رہ گئی۔ ۱۹۴۰ء میں یہ فوج حیرت ناک طور پر وہاں سے نکل آئی۔ ڈنکرک کے اس واقعہ کو برطانیہ اور جرمنی دونوں معجزہ سمجھتے تھے۔ حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ ۳۳۵۰۰۰ افراد پر مشتمل یہ فوج ایک ایسے پچاس میل چوڑے سمندر سے گزر کر وطن آئی تھی جو اپنے خطرات کے لیے مشہور تھا۔ پہلے سے جہازوں کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ جہاز راں بھی ناتجربہ کار

تھے۔ جہازوں میں موٹر لانچوں سے لے کر بادبانی کشتیاں تک شامل تھیں۔ یہ قافلہ تین دن تین رات برابر چلتا رہا۔ ڈنکرک کے اس معجزے میں انسان اور خدا دونوں کا ہاتھ تھا۔ خدا کا کرم یہ ہوا کہ سمندر غیر معمولی طور پر خاموش رہا، ورنہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچتیں۔ سمندر کی یہ خاموشی بھی کسی کام نہ آتی اگر ان کشتیوں میں وہ لوگ موجود نہ ہوتے، جو مہم جُو ہونے کے علاوہ پانی سے بڑے مانوس تھے۔ سپاہیوں کی اتنی کثیر تعداد اس نظم و ضبط کے بغیر ہرگز گھر تک نہ پہنچتی، جس کا مظاہرہ انھوں نے اس موقع پر کیا۔ آسمان سے گولیاں اور بم برس رہے تھے اور یہ قافلہ اطمینان کے ساتھ پانی پر رواں تھا۔

برطانیہ صرف اپنے ساحل کی حفاظت نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے بیرونی راستے بھی کھلے رکھنا چاہتا تھا، اس لیے ڈنکرک سے واپس آنے والی یہ فوج وطن میں مقیم نہ رہ سکی۔ برطانیہ کی ایک شاہراہ بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم اور نہر سویز سے ہوتی ہوئی بحرِ ہند، ہندوستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور تک پہنچی تھی۔ نازی جنوب کی طرف حرکت کر رہے تھے اور یہ ممکن تھا کہ فرانس کی طرح افریقہ میں اس کی نوآبادیاں بھی ہتھیار ڈال دیتیں، لہٰذا ڈنکرک فوج کو تیزی سے مسلح کیا گیا اور ٹھیک اس وقت جب برطانیہ پر جرمن ٹینکوں کے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور جب سولہ سال کے بچے اور ساٹھ سال کے بوڑھے کام کے بعد ہر شب ہوم گارڈ کی تربیت حاصل کرتے تھے، برطانیہ نے اپنی ایک تربیت یافتہ سپاہ خفیہ طور پر شمالی افریقہ بھیج دی، تاکہ بحیرۂ روم اور نہر سویز پر اس کا قبضہ رہے۔

یہ سرونسٹن چرچل کے تدبر کا ایک ادنیٰ کمال تھا جنھوں نے ۱۰ ؍ مئی ۱۹۴۰ء کو فریب خوردہ نوایل چیمبرلین کی جگہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ چرچل نازی جبر و استبداد سے بے حد نفرت کرتے تھے، ان کی عسکری فراست ناممکن کو ممکن بنا سکتی

تھی، وہ ایک جادو اثر مقرر تھے اور نازک سے نازک وقت میں بھی ہمت نہ ہارتے تھے۔ ان تمام صفات نے انھیں برطانیہ کا سربراہ بنایا اور اہلِ برطانیہ نے خدا کا شکر ادا کیا، جس نے انھیں ایسا قابل وزیرِ اعظم عطا کیا تھا۔

ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ برطانیہ کو یہ جنگ جنوبی انگلستان کے سرسبز میدانوں پر لڑنی پڑے گی، لیکن یہ جنگ زمین کے بجائے آسمان پر لڑی گئی۔ جولائی میں دشمن کے طیارے برطانیہ کی سرزمین کا جائزہ لینے کے لیے اکثر ادھر آتے تھے۔ اگست میں ہوائی حملے شروع ہوئے تو لندن والوں نے دوسری مرتبہ (پہلی مرتبہ جنگ شروع ہونے پر) اپنے بچوں کو مع ضروری ساز و سامان، ان کے اساتذہ کے ساتھ دیہات بھیج دیا، تاکہ کم از کم ان کی جان تو بچ جائے۔ ستمبر سے لندن کی لڑائی شروع ہو گئی اور اٹھاون راتوں تک اس قدیم شہر پر مسلسل بم باری ہوتی رہی۔ لندن کے علاوہ کونٹری، برمنگھم ہل اور لیورپول بھی باری باری ان حملوں کا نشانہ بنے۔

یہ جنگ بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ جو سپاہی اپنے محفوظ کیمپوں سے رخصت پر وطن آتے تھے وہ اپنی بیویوں اور ماؤں کو دشمن سے نبرد آزما پاتے تھے اور جو سپاہی افریقہ اور ہندوستان میں تھے، وہ لندن میں مقیم اپنے اعزّا کی خیریت کے منتظر رہتے تھے۔ اکثر اوقات انھیں خطِ شکستہ میں لکھی ہوئی ایسی چند سطریں موصول ہوتی تھیں: "ہمارے گھر پر پرسوں شب ایک بم گرا، امّی بری طرح زخمی ہو گئیں، ان کے جسم سے بہت سا خون نکلا۔ سب نے مل کر انھیں باہر نکالا۔ اب وہ ہسپتال میں ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ باقی ہم سب یہاں پناہ گاہ میں ہیں۔ معلوم نہیں اب کیا ہوگا۔"

دن رات کے ان خطرات کے علاوہ زندگی بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ گیس اور پانی کی سپلائی میں اکثر خلل پڑتا رہتا تھا۔ غذا کے ذخیروں پر بم برستے تھے یا وقتی بم رکھ دیے گئے تھے۔ ہر گلی اور محلہ بند پڑا تھا۔ ریل گاڑیوں اور بسوں کا برا حال تھا۔

ڈاک، دودھ اور اخبار بے ترتیبی کے ساتھ آتے تھے اور وہ بھی باہمت لوگوں کے ہاتھوں۔ سپاہیوں کی طرح شہریوں کی بھی نیند حرام ہو گئی تھی کیونکہ انھیں بمباری کا خطرہ رہتا تھا۔ دن میں کام کرنے، کھانے کی چیزیں مہیا کرنے اور گھر واپس آنے میں پہلے کے مقابلے میں تین گنا وقت خرچ ہوتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو دفاعی فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ وسطِ سرما تک وہ سب اس قدر تھک گئے تھے کہ وہ کہیں بھی سو جاتے تھے۔ — زمین دوز ریلوے سٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر جہاں ہر تین منٹ کے بعد ان کے سروں پر سے گاڑیاں گزرتی رہتی تھیں، گندے گوشوں میں، باغیچوں کی نمدار پناہ گاہوں میں اپنی چارپائیوں کے نیچے — بلکہ اپنے بستروں پر بھی، جہاں وہ برابر بے چین رہتے تھے۔ دور گرنے والا بم بھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سیدھا ان پر گر رہا ہے۔

ایک وقت وہ آیا کہ برطانیہ کی برّی اور ہوائی فوج ہٹلر کی توقعات سے زیادہ قوی ثابت ہوئی۔ رودبار انگلستان کے پانی پر جلتا ہوا تیل پھیل گیا اور اس نے برطانیہ کے ساحل کی بڑی خوبی سے حفاظت کی۔ اس کے بعد برطانیہ کو یک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ اب اس کی سرزمین پر جنگ نہ ہوگی۔ البتہ ہوا اور سمندر پر مزید چار سال تک شدید قسم کی جنگ جاری رہی۔ بمباری کے فن میں جیسے جیسے ترقی ہوئی، برطانوی وسائل کو زیادہ زک اٹھانی پڑی اور شہری آبادی کو مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دقتوں کے باوجود اس بہادر و منظم قوم نے ہمت نہ ہاری۔ مہینوں مقابلہ جاری رہا۔ کسانوں کے بہترین کھیت ہوائی اڈوں یا تربیتی میدانوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ پھر بھی وہ بچی کھچی زمین سے زیادہ سے زیادہ غلّہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کارخانوں اور مزدوروں نے باہمی تعاون سے زیادہ سے زیادہ اسلحہ اور گولا بارود تیار کیا۔ کبھی کبھی یہ منحوس خبر بھی سننے میں آ جاتی تھی کہ ان کی محنت اکارت گئی اور گولے بارود سے لدے ہوئے سب جہاز مالٹا کے قریب غرق کر دیے گئے۔ راشن بمشکل کافی

ہوتا تھا۔ شہروں کے بہت سے مکانات بمباری اور ایندھن کی کمی کی وجہ سے نمدار اور تاریک ہو رہے تھے۔ جون ۱۹۴۱ء میں بغیر کسی انتباہ کے کپڑے پر بھی راشن شروع ہوگیا۔ لوگ آرام وہ ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرتے تھے اور مستقبل کا کوئی بھروسا نہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ برطانیہ یہ جنگ کس طرح جیتے گا۔

اس کے بعد ناقابل یقین واقعات رونما ہوئے۔ جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور اپنی توپوں کا رخ شمال کے بجائے مشرق کی طرف پھیر دیا۔ جو بم انگلستان کے دیہات پر گرتے وہ یوکرائن پر گرنے لگے۔ ایک اور طرف سے بھی اطمینان کی صورت نظر آئی۔ اب امریکا میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا یہ خیال ہو رہا تھا کہ اگر ہٹلر نے پورے یورپ پر حملہ کر دیا تو درمیان میں سمندر حائل ہونے کے باوجود وہ امریکا کے لیے بھی اچھا ہمسایہ ثابت نہ ہوگا لہٰذا امریکا نے اپنے جہازوں میں غذا، کپڑا، طبی امداد، ایمونس اور کینٹین تک لادکر برطانیہ بھیجنی شروع کر دیں۔ جلد ہی وہاں کے صدر نے امریکی تباہ کن جہاز برطانیہ کے حوالے کر دیئے کیونکہ اس کے بہت سے جہاز آبدوزوں کے حملوں کی نذر ہو رہے تھے لیکن پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے اور امریکا کے خلاف جرمنی کے اعلانِ جنگ سے قبل ریاست ہائے متحدہ امریکا نے ایک ایکٹ کی منظوری دے دی جس کی رو سے وہ برطانیہ اور دوسرے اتحادی ممالک کو ضروری ساز و سامان دینے پر تیار ہو گیا خواہ وہ اس کی قیمت ڈالر میں ادا بھی نہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ممالک نے اپنے مختصر وسائل امریکا کے اختیار میں دے دیئے تاکہ جہاں کہیں ضرورت ہو وہ استعمال کیے جائیں اور امریکی جان و مال ضائع ہونے سے بچا یا جائے۔ اس اثنا میں برطانیہ نے اپنی فوجوں کے لیے قیام گاہوں، فوجی ساز و سامان اور تربیت کا انتظام کیا اور مفتوحہ ممالک کو مالی امداد دی تاکہ ضرورت پڑنے پر ان کی مدد حاصل کر سکے۔ ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لیے برطانوی عوام پر اتنے ٹیکس لگائے گئے کہ امریکیوں کو مشکل سے ان کا یقین آئے گا۔

سامانِ تعیش مثلاً زیوروں، خوشبوؤں اور پوستینوں وغیرہ پر سو فیصدی اور گھریلو استعمال کی بہت سی اشیاء پر ساٹھ فیصد بکری ٹیکس عائد کیا گیا۔ بیس سگرٹوں کی ڈبیا پر پینتیس سینٹ ٹیکس لگا اور اس کی قیمت سینتالیس سینٹ ہو گئی۔ ایک حد کے بعد ہر شخص کی آمدنی کا نصف حصہ انکم ٹیکس کی شکل میں وصول کر لیا جاتا تھا۔ تجارتی کمپنیوں کے منافعوں پر بھی ایک حد کے بعد سو فیصد ٹیکس لگایا گیا۔

جب جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تو اہلِ برطانیہ نے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ خبر سنی۔ انھیں یہ خوشی ضرور تھی کہ اب امریکا اپنے پورے وسائل اتحادیوں کی حمایت میں استعمال کرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اہلِ امریکا سے ہمدردی بھی تھی کیونکہ انھیں ان کے جذبات واحساسات کا پورا اندازہ تھا۔ اہل برطانیہ کو اپنے ہم وطنوں کا خیال بھی تھا جو ہزاروں کی تعداد میں سنگاپور، ہانگ کانگ اور دوسرے مشرقی مقامات پر پڑے ہوئے تھے۔

امریکا کے جنگ میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تمام شبہات دور ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں امریکی فوج کے پہلے دستے شمالی آئرلینڈ پہنچے۔ اس کے بعد ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور آخر میں ہر جگہ امریکی ہی امریکی نظر آنے لگے —— ٹریبنوں میں، بسوں میں، ہوٹلوں میں، تفریح گاہوں میں۔ برطانیہ کے ایک شخص نے کہا تھا۔ "اب مجھے اندازہ ہوا کہ امریکا کے اصل باشندوں نے سفید فام اقوام کے وارد ہونے پر کیا محسوس کیا ہوگا۔" امریکی سپاہیوں کو خود بھی اس بات کا خیال تھا کہ ان کے آجانے سے برطانیہ کے باشندوں کی حالت خراب تر ہو گئی ہے۔

وقت گزرتا گیا حتّٰی کہ شمالی افریقہ میں العلمین کے مقام پر برطانیہ کو پہلی اہم فتح حاصل ہوئی، جس نے جنگ کا رخ پھیر دیا۔ اس کے بعد افریقہ میں کاسابلانکا سے جنگوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اطالوی حملہ ہوا اور برطانیہ میں دیہات کے دیہات خالی ہوتے

گئے تاکہ فوجوں کی تربیت کے لیے زیادہ جگہ مل سکے۔ ۶ جون ۱۹۴۴ء کو امریکا اور برطانیہ نے اتحادیوں کی مدد سے مغرب کی طرف سے یورپ پر حملہ کیا۔ کچھ دنوں بعد امریکا کی ساتویں سپاہ نے جنوبی فرانس کی طرف سے حملہ کیا۔ برطانیہ نے جنگ ختم کرنے کے لیے ارن ہائم پر ہوائی جہازوں کے ذریعے سے اپنی فوج اتارنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اور دسمبر میں نازیوں نے اتحادیوں پر ایک کاری ضرب لگائی لیکن اسے روکا گیا۔ ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو یورپی جنگ ختم ہو گئی۔ تین ماہ بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ امریکا نے اس کے دو اہم شہروں پر ایٹم بم گرائے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی اور سب ملکوں کو اپنے نقصان کو پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور سب نے یہ سوچا کہ مستقبل میں یہ غلطیاں سرزد نہ ہونی چاہئیں۔ ایٹمی ہتھیاروں سے سب خائف تھے، کسی صورت ان سے بچا جائے۔ سب ملکوں کی توقعات بلند تھیں۔ اسی فضاء میں جنوری ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ کا پہلا اجلاس لندن میں منعقد ہوا۔ اقوام متحدہ، سیکیورٹی کونسل اور بعد میں ناٹو وغیرہ کے قیام سے بین الاقوامی سیاست کی بساط بہت کچھ بدل گئی۔

اس تبدیلی سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ مستقبل کے نئے مسائل کی پیش گوئی کی بہ نسبت ماضی کی غلطیوں سے بچنا آسان تھا۔ روس ہٹلر کے خلاف تھا، اس لیے اتحادیوں سے ملا رہا لیکن جنگ ختم ہو گئی تو وہ مغربی تہذیب کا دشمن ہو گیا۔ مجلسِ اقوام متحدہ اس قسم کی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے سے عاری تھی۔ دُنیا کے بہت سے حصوں میں بدامنی پھیل گئی۔ جب کوریا میں مغربی اتحادیوں اور کمیونسٹ گروہ کے درمیان پہلا تصادم ہوا تو اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے لڑنے والوں میں اکثریت امریکی سپاہیوں کی تھی۔ برطانیہ میں دو سال تک جبری بھرتی ہوتی رہی تھی۔ اس کی ۴/۵ حصہ فوج باہر تھی۔ کچھ کوریا میں کچھ جرمنی میں، کچھ ملایا میں، کچھ نہر سویز کے ساحل پر، کچھ سنگاپور ہانگ کانگ میں اور کچھ کینیا

ہیں۔ دنیا کے نقشے میں جہاں جہاں روایتی طور پر سرخ رنگ سے برطانوی مملکتوں کی علامتیں ظاہر تھیں، برطانیہ انھیں جوں کا توں دیکھنا چاہتا تھا اور انھیں روس کے اثر سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

برطانیہ کے عوام جنگ ختم ہونے کے بعد دوسرے مسائل میں مصروف ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بین الاقوامی معاملات میں ان کے ملک کو کیا کرنا چاہیئے۔ اگر امریکا اور یورپی ممالک برطانیہ سے یورپی اتحاد کی درخواست بھی کرتے تو بھی کچھ انگریز اس سے اختلاف کرتے کیونکہ وہ مدت سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ برطانیہ ماضی کی طرح اب بھی یورپ میں اپنی اہمیت برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے یورپی ممالک کا یکجا ہونا ضروری نہ تھا۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر یورپ کی مختلف قسم کی آبادی پر امریکی طرز کی حکومت ٹھونسی گئی تو نتیجہ شورش اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ اس حقیقت سے کوئی روگردانی نہ کر سکتا تھا کہ برطانیہ کو یورپ کی اور یورپ کو برطانیہ کی ضرورت تھی۔

اہل برطانیہ نے بین الاقوامی حکومت کے معاملے میں اپنے تجربے پر نظر ڈالی —چند نو آبادیاں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ بھی خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کچھ آزاد ممالک ایسے تھے جنھوں نے برطانیہ کو ہر قسم کی امداد دی تھی اور انھیں اس کی بڑی خوشی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کو آزادی ملی اور جب ان دونوں ملکوں نے اپنی خوشی سے دولتِ مشترکہ میں شامل ہونا چاہا تو برطانیہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کینیڈا پہلے سے دولتِ مشترکہ کے رکن تھے۔ اب اس رکنیت میں وزن پیدا ہو چکا تھا۔ جون ۱۹۵۳ء میں دولتِ مشترکہ کے تمام وزرائے اعظم ملکہ الزبتھ دوم کی رسمِ تاجپوشی کے موقع پر لندن میں جمع ہوئے۔ وہ اب بھی احساس فرض، ایثار اور وفاداری کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ ایک کانفرنس میں شریک ہوئے جس میں تجارت، مالی استحکام اور دفاع وغیرہ کے مسائل پر بحث ہوئی۔ ان کا دائرۂ نظر وسیع تھا اور وہ

اپنے عوام کی خدمت پر تلے ہوئے تھے۔ ان مدبّروں کے تدبّر سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ قومیت کے فرق کے باوصف ان کے ملکوں کے درمیان مستقبل میں کوئی نزاع پیدا نہ ہوگا۔

رسمِ تاجپوشی کے اس اہم موقع پر برطانیہ نے اپنے بہترین شعراء کو نظمیں لکھنے اپنے مغنیوں کو نغمہ سرائی، اپنے فن کاروں اور ماہرین تعمیر کی موقع کے لحاظ سے لاجواب آرائش کی اور اپنے کاریگروں کو ملکہ کی پوشاک کے لیے نفیس ترین ریشم تیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ ان تمام ماہرین کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ قوم کی امیدوں پر پورا اترا اور اس رسم کی ادائگی کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ الزبتھ اوّل کے انگلستان نے بہت سی دشواریوں پر قابو پایا تھا اور الزبتھ دوم کا انگلستان بھی یہی تہیّہ کیئے بیٹھا تھا۔

دشواریاں بہت تھیں۔ انگلستان نے سمندر پار بہت سے ملکوں میں سرمایہ لگایا تھا مثلاً ارجن ٹائن کی ریلوے لائنیں وغیرہ۔ جنگ کے اخراجات ادا کرنے اور غذائی اشیاء خریدنے کی غرض سے اس قسم کی املاک فروخت کر دی گئیں۔ کچھ ملکوں نے دوران جنگ میں اپنی صنعتوں کو فروغ دیا یا وہ کمیونسٹ بلاک میں شامل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں برطانیہ کی تجارت زوال پذیر ہو گئی۔ خام مال خریدنے کے لیے ڈالروں کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ آئیں کہاں سے ؟ تجارتی پابندیوں کی وجہ سے انگلستان کا مال ریاست ہائے متحدہ امریکا میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ انخلاء کے باوجود آبادی میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ صورتِ حال بالکل واضح تھی۔ اگر برطانیہ کا مال دوسرے ملکوں میں پہلے سے بھی زیادہ نہ جاتا تو وہ دیوالیا ہو جاتا اور لوگ بھوکوں مر جاتے۔

آٹھ سال کی تعمیرِ نو کے باوجود برطانیہ میں مکانات، سکولوں اور کارخانوں کی کمی تھی۔ گوشت اور دیگر غذائی اشیا پر ابھی تک راشن تھا۔ ٹیکس ابھی تک غیر معمولی طور

پر زیادہ تھے۔ کہیں ۱۹۵۲ء میں سامانِ تعیش پر بکری ٹیکس سو فیصدی سے کم کر کے چھیاسٹھ فیصدی کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک وہاں لیبر گورنمنٹ رہی۔ اس کی قائم کردہ ویلفیئر سٹیٹ کے ناقدین کو یہ اندیشہ لاحق رہا کہ برطانیہ کی اپنی آمدنی اور امریکی امداد دونوں سوشلزم کے تجربات پر ضائع ہو رہی ہیں۔ بعض صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے سوال پر برطانیہ میں اختلافِ رائے رہا۔ لیکن دونوں سیاسی پارٹیوں کے ارکان کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ ملک اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ بنیادی مسئلہ مزدوریوں کا تھا۔ برطانیہ میں مزدوریاں اس حد تک نہ بڑھائی جا سکتی تھیں کہ اس کا مال سمندر پار کے ملکوں میں بہت زیادہ مہنگا فروخت ہو، لیکن برطانوی کاریگروں کی حالت سدھارنا بھی ضروری تھا۔ ورنہ ان سے کام نہ لیا جا سکتا تھا اسی وجہ سے نیشنل ہیلتھ سروس جیسی چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بعض نقائص کے باوجود ہیلتھ سروس کا منصوبہ کامیاب رہا، لیکن کچھ تجربات ناکامیاب بھی رہے اور لندن کے اُن شہریوں نے جنھوں نے بارش اور سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے ملکہ کا جلوس دیکھا تھا، یہ محسوس کر لیا کہ الزبتھ دوم کے انگلستان میں زندگی صرف پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

اس بات کا امکان بھی زیادہ نظر نہ آتا تھا کہ الزبتھ آرام اور آسانی کے ساتھ اتنی اقوام کی سربراہی کے فرائض انجام دے سکیں گی۔ ان کے دورِ حکومت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس وقت شروع ہوا جب یہ چھبیس سالہ شہزادی سرکاری مہمان کی حیثیت سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جا رہی تھیں اور اس وقت کینیا میں مقیم تھیں۔ جارج ششم اپنے بھائی کے دست بردار ہونے پر تختنشین ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے فرائض اچھی طرح سرانجام دیے۔ یہی تعلیم انھوں نے اپنی بیٹی کو بھی دی تھی۔ جب الزبتھ کی شادی لیفٹیننٹ فلپ ماؤنٹ بیٹن سے ہو گئی تو موخرالذکر پرنس فلپ آف گریس کے خطاب سے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے برطانیہ کی مدنیت اختیار کر لی۔ شادی کے بعد وہ ڈیوک آف ایڈنبرا کہلانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا وارثِ تخت و تاج بھی پیدا ہو گیا۔ پھر ایک بیٹی ہوئی۔ الغرض شہزادی الزبتھ

کو دنیا کی تمام خوشیاں حاصل ہوئیں اور وہ بحیثیت ایک ملکہ کے اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے لگیں۔ نہ صرف انگلستان میں بلکہ پوری دنیا میں شاہی خاندان قدر کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

گزشتہ صدیوں میں انگلستان بہت سی خانہ جنگیوں اور اندیشوں میں مبتلا رہا۔ تب کہیں زندگی کی بعض اچھی چیزیں حاصل ہوئیں —— آزادی، انصاف، رواداری اور مثالی طرزِ حکومت۔ ستاون دوسرے ممالک نے اسی پارلیمانی نظام کی تقلید کی۔ برطانیہ کا معیار زندگی بھی بہت بلند تھا۔ ۱۹۵۳ء میں انگلستان نے مابعد جنگ کی مشکلات اور حالیہ برسوں کی دقتوں پر نظر ڈالی لیکن ہمت نہ ہاری۔ اُس نے ہمت اور جواںمردی کے ساتھ نئے الزبتھی دور کا استقبال کیا اور اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی قسم کھائی۔

چودھواں باب

انگریز اور اُن کا مستقبل

انگریز کیسے ہوتے ہیں؟ بعض لوگ ان کے متعلق مختلف رائے قائم کرتے ہیں۔ مزاحیہ تصاویر میں انگریز کی جو شکل بنائی جاتی ہے وہ انگلستان میں بھی مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ برطانوی باشندے (جس سے عام طور سے انگریز مراد ہوتے ہیں) اتنے عیّار ہوتے ہیں کہ ان کا سابقہ پڑ جائے تو وہ اپنی قمیص سے محروم ہو جائیں گے "۔ دوسری طرف انگریز امریکیوں کے متعلق اِسی قسم کی رائے رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ امریکی اتنے بھولے ہوتے ہیں اور نہ انگریز اتنے سست جیسا وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

انگریزوں پر ریاکاری یا بدمعاملگی کا الزام کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتا۔ وہ امریکیوں کی بہ نسبت اپنی تاریخ کی تلخیاں زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں اور انھیں دوسرے ملکوں کی تاریخ بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ اگر ان کی حکومت کوئی غلط قدم اٹھاتی ہے تو وہ شدت سے احتجاج کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج دنیا بڑے مشکل مسائل سے دوچار ہے انھیں یہ احساس بھی ہے کہ وہ غلطیاں بھی کرتے ہیں خواہ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا بننے کی کتنی بھی کوشش کریں۔

انگریز اپنے پیدا کردہ دو اثرات کو مطلق نہیں سمجھ سکتے۔ ایک ملا جُلا وہ تاثر جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ انگریز اتنے چالاک سودے باز ہوتے ہیں کہ امریکی ان کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انگریز سست اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ انھیں

اپنی روایات کا بڑا پاس ہوتا ہے۔ ان میں ایک نہ ایک خصوصیت موجود ہو سکتی ہے۔ انگلستان یا اس سے باہر اس کی مثال مل سکتی ہے لیکن دونو خصوصیات یکجا نہیں ہوتیں۔

دوسرا تاثر جس سے انگریزوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے، لوگوں کا یہ یقین ہے کہ وہ مذاق کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ درست ہے کہ ان کا مذاق امریکیوں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ ان کی بعض باتیں امریکیوں کی سمجھ میں اور امریکیوں کی بعض باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں لیکن مذاق کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ آج جو مذاق امریکہ میں عام ہیں وہی تیس سال پہلے انگلستان میں عام تھے۔

اگرچہ کوئی شخص بھی اپنے الفاظ میں انگریزوں کی صحیح تصویر پیش نہیں کر سکتا پھر بھی ہر قوم کی بعض ایسی خصوصیات بیان کی جا سکتی ہیں جو ان کی تاریخ میں ممتاز نظر آتی ہیں اور انھیں دوسری اقوام پر ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصیات ان قوموں سے تعلق رکھتی ہیں جو مل ملا کر اب انگریز کہلاتی ہیں۔ کلٹی قوم کی فن کاری انگلستان کی لاجواب شاعری عوامی طمطراق اور ان کی تلوّن مزاجی میں موجود ہے جس سے ان کی روزمرّہ زندگی میں یک گونہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اس قوم میں تنظیم اور حکومت کی ایسی عمدہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کسی تحریری دستور کے بغیر بھی سات سو سال تک کام چلا سکتی ہے۔ تحریری دستور حالیہ چند برسوں ہی میں تیار ہوا ہے۔ انگریزوں کو یہ صلاحیت ایک طرف رومنوں سے ملی ہو گی اور دوسری طرف نورمنوں سے جن میں بلا کی تنظیم پائی جاتی تھی۔ انھوں نے فنِ تعمیر اور انجینیرنگ میں بھی بہترین روایات قائم کیں۔ انگریزوں کو سمندر سے اس قدر لگاؤ ہے کہ امریکی ان سب کو مذاق میں "لیمی" کہنے لگے حالانکہ یہ "خطاب" اصل میں ان ملاحوں کو دیا گیا تھا جو اسقربوط اور دوسرے امراض سے بچنے کے لیے طویل بحری سفر میں لیموں کا عرق استعمال کرتے تھے۔ بہت سے جزیروں کے باشندے سمندر سے محبت کرتے ہیں لیکن اہلِ برطانیہ کو سمندر کو مسخر کر لینے والی غیر معمولی صلاحیت شاہ ایلفرڈ

کے سیکسنوں اور دورس نورس مین اور ڈینیز سے ورثے میں ملی ہے۔

انگریز آرام طلب ہوتے ہیں۔ وہ اپنا جائزہ لیتے وقت یہ کہتے ہیں کہ ہم سست ہو سکتے ہیں لیکن آرام طلب نہیں ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ رواداری سے کام لیتے ہیں لیکن اسے اپنی صفت نہیں سمجھتے۔ ان کی رواداری کا اصل سبب یہ حقیقت ہے کہ انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں تین کروڑ ستر لاکھ افراد آباد ہیں۔ جب تک اُن میں رواداری نہ ہو وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ میں کار میں جارہی تھی کہ ایک جگہ ٹریفک رک گیا اور ایک گھنٹے تک رکا رہا پھر بھی کسی کار کے ہارن کی آواز نہیں سنائی دی۔ میرے انگریز دوست میرے استعجاب پر ہنسے اور کہنے لگے "ہارن بجانے سے بعض لوگ حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بند سڑک کے کھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔" میں نے لوگوں کو عجیب و غریب لباس پہنے دیکھا ہے ـــــ مثلاً ایک نوجوان عادۃً سبز رنگ کا پورا سوٹ اور اٹھارویں صدی کا پورا لباس پہنتا تھا ـــــ لیکن کوئی شخص بھی ایسے لوگوں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص پرانی صدی کے کسی لباس کو پسند کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اسے روزانہ استعمال نہ کرے۔ کتوں تک کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اجنبیوں پر صرف اس وقت بھونکیں جب ان کے ارادے خطرناک نظر آئیں۔

رواداری اور درگزر کی یہ صفات آسانی سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ ابھی حال تک یہ صفات انگریز قوم کی خصوصیات میں شامل نہ تھیں۔ ان لوگوں نے برسوں اپنے بعض قوی جذبات کو چھپا چھپا کر انھیں حاصل کیا ہے مثلاً استعجاب، خوشی، بے صبری یا رنج تاکہ ان کی وجہ سے دوسرے لوگ پریشان نہ ہوں۔ دوسری قومیں یہ سب کچھ دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اہلِ برطانیہ بے حس اور سخت دل ہوتے ہیں۔

جذبات پر قابو پا لینے کی اس عادت کے ساتھ ساتھ انگریز اجنبیوں پر اپنی نجی زندگی کے راز افشاء کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ انھیں امریکیوں کے تہوار "یوم مادر"[ط] سے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن وہ خود اپنی مرحومہ ماؤں کے لیے سفید اور زندہ ماؤں کے لیے گلابی لباس پہننے سے گریز کریں گے کیونکہ ایسا کرنے سے لوگ ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں گے یا انھیں مبارک باد دیں گے۔ وہ اجنبیوں سے کچھ نہیں چاہتے۔ اسی طرح ان کے ہاں یہ رواج بھی نہیں کہ جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کی یاد میں وہ کھڑکیوں میں سونے کے ستارے لٹکائیں۔ آپ کو صرف ان کے گھر کے اندر پہنچ کر ان کے غم کا اندازہ ہو سکتا ہے جیسا کہ مجھے ایک دیہات کے پوسٹ ماسٹر کی بیٹھک میں جا کر ہوا۔ ہر طرف مصنوعی پھولوں کے گلدان رکھے ہوئے تھے —— آتش دان کے تختے پر، پیانو پر، ریڈیو پر غرض کہ ہر چیز پر لیکن میز پر چھ پنی والا خوش رنگ گل ہوا کا ایک خوشہ رکھا تھا اور اس کے پیچھے ایک نوجوان ملاح کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔

"یہ میرے اکلوتے بیٹے کی تصویر ہے جو "ہڈ" جہاز پر تھا" اس کی ماں نے کہا۔ یہ عظیم جہاز چھ ماہ پیشتر گم ہو چکا ہے"۔

انگلستان میں اوسطاً سات سو افراد فی مربع میل آباد ہیں۔ اس وجہ سے وہاں ایک اور قومی خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ لوگ تفریح اور سکون کے لیے آدمیوں کے بجائے بعض اشیاء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ امریکیوں کے نزدیک تفریح کے معنی یہ ہیں کہ وہ کوئی پارٹی دیں یا کسی جھگڑے میں شامل ہوں۔ اس کے برعکس بہت سے انگریز ایسے ہیں جن کے نزدیک سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ وہ تن تنہا دور تک ٹہلتے نکل جائیں۔ انھیں تنہائی اس لیے پسند آتی ہے کہ وہ ہر وقت ہزاروں آدمیوں کے درمیان رہتے ہیں۔ اور

ط Mother's Day

اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق ان کے ساتھ ہر وقت اخلاق اور نرمی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لندن میں آپ کو ہر شخص جلدی میں نظر آئے گا۔ آپ کسی کو روک کر راستہ پوچھیئے۔ دل میں وہ سوچے گا "اُفوہ، میری ٹرین چھوٹ جائے گی" لیکن آپ کو اخلاق سے جواب دے گا۔ پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہ فرصت کے اوقات تنہائی میں بسر کرنا چاہتا ہے۔

رواداری، حالات و واقعات کا حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینا۔ خوش مزاجی نرم دلی جس کی ایک شکل خوش خلقی ہے —— یہ ہیں وہ خصوصیات جن کی بنا پر لوگ آسانی سے انگریزوں کے ساتھ گزارہ کر لیتے ہیں۔ نہ وہ ان سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور نہ ان کی رواجی بے حسی سے گھبراتے ہیں۔ کیا دنیا کو انگریزوں سے کسی بات میں ڈرنا چاہیئے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ انگریز اپنی روزی نہ انفرادی طور پر کھونا چاہتے ہیں اور نہ ایک قوم کی حیثیت سے۔ اگر کوئی قومی عالمی ادارہ یہ ضمانت دے دے کہ برطانیہ کو روزگار اور غذا ملتی رہے گی تو برطانیہ اپنی سلطنت اور دولتِ مشترکہ کے قیام کے لیے اپنی مساعی کم کر دے گا۔ جب تک اس قسم کی ضمانت موجود رہے گی، برطانیہ اپنے ماقبل جنگ کے نظام کو محفوظ رکھنے کے لیے سب کچھ کرے گا۔

قومی حفاظت کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ جنگ کا کوئی خطرہ نہ رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ دل و جان سے پائدار امن کا حامی ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں کام آنے والے امریکیوں کے مقابلے میں برطانیہ کے تقریباً تین گنا سپاہی جان سے گئے۔ یہ صورت ایٹم بم کے استعمال سے پہلے تھی۔ ایٹم بم سے ساری دنیا کا امن خطرے میں ہے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرہ جزائرِ برطانیہ کو لاحق ہے۔ جہاں تھوڑی سی جگہ میں بہت سے لوگ آباد ہیں۔

اہلِ برطانیہ کے نزدیک انفرادی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچے کے لیے تعلیم

کا انتظام موجود ہو اور ہر شہری کے لیے روزگار، کافی غذا، کپڑا، اچھا مکان اور طبی امداد مہیا کی جائے۔ جب وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے تو اسے اتنی پنشن ملے کہ وہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس کے علاوہ اگر موٹر کاریں، خودکار مشینیں اور سامانِ تعیش عام ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ دنیا کی دوسری اقوام کی طرح انگلستان کے لوگ بھی ان چیزوں کے اُتنے ہی خواہش مند ہیں لیکن وہ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ان کا معیارِ زندگی ایک مناسب حد تک بلند ہو جائے۔

اہل برطانیہ تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ اپنا معیارِ زندگی پہلے سے بھی بلند کریں گے۔ جو کہانی شاہ جون کے ۱۲۱۵ء میں میگنا کارٹا پر دستخط کرنے کے ساتھ شروع ہوئی تھی، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ انگلستان کی تاریخ ایک عام انسان کی داستانِ حیات ہے جس نے غلامی سے اٹھ کر آزادی، سیاسی اقتدار اور پھر اقتصادی برابری حاصل کی۔ یہ ایک عام انسان کے احساسِ ذمہ داری کے ارتقاء کی داستان بھی ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بھی قوم اس حقیقت کو انگریزوں سے زیادہ محسوس نہیں کرتی کہ اقتدار کے ساتھ دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کا بھاری فرض بھی ادا ہو جاتا ہے۔ غالباً کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ آئندہ دنیا کی مقتدر اقوام میں برطانیہ کا مقام کیا ہوگا، لیکن اس کے عوام ہمیشہ ان چار آزادیوں کے حق میں آواز اٹھائیں گے جن کے لیے وہ خود عرصۂ دراز تک لڑتے رہے ہیں اور اب بھی کام کر رہے ہیں۔ اور جب تک ہر ملک کے لوگ ہر قسم کے خوف اور احتیاج سے آزاد نہیں ہو جاتے اُس وقت تک انگلستان ان کی حمایت کرتا رہیگا یہی وہ ملک ہے جس میں آزادی نے سب سے پہلے جڑیں پکڑیں۔

LIBRARY,
Govt.
15, Lake Road
LAHORE

بچّوں کے دلچسپ ناول

ایک مکان دو دیواریں - ہونہار امجد نہایت شریر اور شوخ لڑکا ہے - لیکن بلا کا ذہین بھی ہے اس کی شوخی اور شرارت کا انجام ایک مکان میں دو دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں اور اسے بہت دکھ جھیلنا پڑتے ہیں لیکن اس کی نیکی اور بلند کرداری تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیتی ہے —— پھر مکان کی دیواریں گر جاتی ہیں اور نہ صرف سارا گھر بلکہ تمام ملک اسے ایک ہی مکان محسوس ہوتا ہے —— ایک نیک بچّہ کی نفسیات اور اس کے اخلاق اور اصلاحی پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کیئے گئے ہیں - قیمت ۹۴ پیسے

عقاب - لطیف فاروقی - یہ تاریخ اسلام کی ایک داستان ہے، جس کا تعلق موسیٰ بن نصیر سے اور بربر قبیلہ کے ایک فرد یعقوب سے ہے - موسیٰ بن نصیر کے سکول میں یعقوب جب اپنے بچوں کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سردار حسیب سے تلوار چل جانے پر نوبت پہنچتی ہے لیکن علم کے شیدا یعقوب اور ان کے بچے حالات پر اس طرح قابو پاتے ہیں کہ سارا قبیلہ پھر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے اور یہ علم کی بدولت موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے کئی مفتوحہ علاقوں کے حاکم بن جاتے ہیں - قیمت ۷۵ پیسے

یہ غازی - سید نظر زیدی - اس تلوار کے حیرت انگیز کارنامے، جو آج سے سالہا سال پہلے غازی اسلام صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں انجام پائے، اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں - اس کے مطالعہ سے عزم و ہمت، جوش و ولولہ، اخلاق و کردار کی بلندی اور اسلام کی سچی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے - قیمت ۷۵ پیسے

جاسوس ابوالحسن نغمی - یہ ناول بچوں کے کھیل کود اور ہنسی دلگی سے شروع ہوتی ہے لیکن کچھ غیر مذہب کے چالاک اور فریبی دوستی کے پردے میں ان کے دیس کی آزادی میں زہر ملانے کی کوشش کرتے ہیں - مخالف طاقتوں کے جال پوشیدہ طور پر بچھاتے ہیں اور انھیں بہت سے راز

خفیہ طریقوں سے پہنچاتے ہیں ـــــ لیکن یہی کھلنڈرے بچے اپنی ذہانت کی بدولت اپنے ملک اور قوم کو دشمنوں کے خطرے سے بچا لیتے ہیں اور یہ پاک باطن سراغ رسان دشمن کے عجیب و غریب بھید کھولتے ہیں۔ نہایت دلچسپ جاسوسی ناول۔ قیمت ۱۶۱۳ روپے

بھرے جنگل ہیں۔ کمال احمد رضوی۔ یہ ایک بن بلاؤ اور ایک شکاری کی داستان ہے نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز۔ یہ غلامی اور آزادی، انسان اور حیوان کی اچھائی و برائی کے فرق کو ظاہر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان زور اور ظلم کے نشہ میں حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے اور بھرے شہر کو خوفناک جنگل بنا کر انسانیت کو بدنام کرتا ہے۔ حد درجہ مفید و نصیحت آمیز ہے۔ یہ مغربی زبان کی ایک ناول سے اخذ کی گئی ہے۔

ہمّت کرے انسان :- سیّن نظر زیدی
صفحات ۱۲۴ قیمت ۸۴ پیسے

پانی کا شہر :- مصنف ھنس انڈرسن کی کتاب پریوں کی داستان کا ترجمہ صفحات ۱۲۰ قیمت ۶۷ پیسے

جانِ عالم :- ابوالحسن نغمی
صفحات ۱۴۰ قیمت ۸۷ پیسے

برف کا ستارہ :- انجم کمال
صفحات ۱۴۴ قیمت ۹۷ پیسے

ایک بادشاہ ایک درویش :- لطیف فاروقی
صفحات ۹۶ قیمت ۶۷ پیسے

پہلا مجاہد :- سیّن نظر زیدی صفحات ۱۸۶ قیمت ۱۶۲۵ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز کشمیری بازار ـ لاہور

بچوں کے لیے

دلچسپ اور مفید سائنسی معلومات کی کتابوں کا سلسلہ

(یہ سب کتابیں خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں)

آنکھوں سے کام لیجیے	ترجمہ	محمد سعید	۱/۵۰
آواز کی کہانی	ترجمہ	مسعود احمد خاں	۱/۲۵
بچوں کے لیے سائنسی تحقیق کی نئی راہیں	ترجمہ	محمد فاروق	۲/۵۰
تمہارا جسم کیونکر کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۴/۵۰
ریڈیو اور ٹیلی ویژن	ترجمہ	سید ذوالفقار علی بخاری	۴/۵۰
حیوانی زندگی کا ماضی و حال	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۵/-
دنیا پر پہلی نظر	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۱/۵۰
زمین کی سرگذشت	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس باتوں باتوں میں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس کے نئے اُفق	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
ستاروں کی دنیا	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
سائنس کی حیرت انگیز باتیں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
عجائباتِ کیمیا	ترجمہ	محمد فاروق	۴/۵۰
سمندروں کی دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۴/۵۰
کیمیا کے رومان	ترجمہ	پروفیسر حمید عسکری	۵/-
موسم کی کہانی	ترجمہ	بشیر احمد ساجد	۴/۵۰

وابستہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۱۹، لاہور

مشہور مہمات سائنس	ترجمہ	محمد فاروق	۴ / ۵۰
میرے اندر کیا ہے	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۱ / ۵۰

بنیادی سائنس کا سلسلہ

(بہترین آفسٹ طباعت رنگا رنگ تصاویر)

(مطبوعہ ایران)

انسانی مشین	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱ / ۵۰
آواز	〃	〃	۱ / ۵۰
پرندے	〃	〃	۱ / ۵۰
پھول پھل اور بیج	〃	〃	۱ / ۵۰
چاند	〃	〃	۱ / ۵۰
حرارت	〃	〃	۱ / ۵۰
روشنی	〃	〃	۱ / ۵۰
زندہ اشیاء	〃	〃	۱ / ۵۰
ستاروں سے آگے	〃	〃	۱ / ۵۰
کششِ ثقل	〃	〃	۱ / ۵۰
کیڑوں کی سماجی زندگی	〃	〃	۱ / ۵۰
مٹی	〃	〃	۱ / ۵۰
مشینیں	〃	〃	۱ / ۵۰
مقناطیس	〃	〃	۱ / ۵۰
موسم	〃	〃	۱ / ۵۰

مطبوعات فرینکلن پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، ۶۶ مزنگ روڈ، لاہور

فنی معلومات

(ذیل کی کتابیں بھی رنگین تصویروں سے مزین ہیں)

بجلی کی پہلی کتاب	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۱/۲۵
خلا میں سفر کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
طیاروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
موٹروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰

تاریخ

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (تصویردار)	ترجمہ	مولانا عبدالمجید سالک	۱/۵۰
سو تاریخی واقعات (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا غلام رسول مہر	۷/-

سوانح

سو بڑے آدمی (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۵/-
غریب لڑکے جو نامور ہوئے (مصور سرورق)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۴/-
لڑکیاں جو نامور ہوئیں	ترجمہ ترتیب	اختر عزیز احمد مولانا عبدالمجید سالک	۵/-
مشہور موجد اور ان کی ایجادیں	ترجمہ	ابوالحسن نغمی	۲/۷۵

ہماری دیگر مطبوعات

(والدین اور اساتذہ کی رہنما مصوّر کتابیں)

(یہ سب کتابیں تصویردار ہیں)

آپ کے بچے کی وراثت	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/-
بچوں کی بدتمیزیاں	"	"	۱/-
بچوں کے کھیل	"	"	۱/۵۰
بچے کی اخلاقی قدریں	"	"	۱/۵۰
کامیاب باپ	"	"	۱/۵۰
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی	"	"	۱/۵۰

صحت اور طب

بچہ اور اس کی دیکھ بھال	تصویردار	ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۶/۵۰
آپ کے بچے کی صحت	تصویردار	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۶۲
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو		ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
اتفاقات جو عظیم طبّی کارنامے بن گئے		ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۵/-

سیاست

اقوامِ متحدہ	ترجمہ	فضل حق قریشی	۴/-
امریکہ کا سیاسی نظام	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۲/۵۰

مذہب و اسلامیات

خدا ہمارے ساتھ ہے	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۲۵
خدا موجود ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	۲/۵۰
اسلام اور قانون جنگ و صلح	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۹/-

تعلیم و تعلّم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین	ترجمہ	سید وقار عظیم	۳/-
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون	ترجمہ	فضل محمد خاں	۸/-
تعلیم کے مقاصد	ترجمہ	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۵/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی	ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
والدین اور معلمین	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/-
ثقافت کا مسئلہ	"	"	۱/-
قدیم تہذیب اور جدید انسان	"	"	۳/۵۰
قدیم علوم اور جدید تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/-

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	
جلد اول، تاریخ اسلام	"	"	۱۲/-
جلد دوم، تاریخ عالم	"	"	۱۲/-
جلد سوم	"	"	۱۴/-

تاتاریوں کی یلغار	ترجمہ	عزیز احمد	۱۲/-
صلیبی جنگیں	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۵/-
عرب دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر محمود حسین	۱۲/-
بیس جنھوں نے دنیا بدل ڈالی	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/-

سوانح

ایڈیسن	ترجمہ	محمد سعید	۳/۵۰
چند عظیم علمائے جراثیم	ترجمہ	عبدالمجید قریشی	۱۰/-
سقراط	ترجمہ	آنسہ صبیحہ حسن	۲/۵۰
غازیان تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۵/-
سلطان صلاح الدین ایوبی	ترجمہ	پروفیسر محمد یوسف عباسی	۱۷/۵۰
نور محل	ترجمہ	شبلی ایم کام و حبیب اشعر دہلوی	۷/۵۰

معاشیات

آبادی کا مسئلہ	ترجمہ	شبلی ایم کام	۱/۵۰
خوراک کا مسئلہ	ترجمہ	" " "	۱/۵۰
عظماء کے معاشی نظریات	ترجمہ	ڈاکٹر ایس ایم اختر	۶/-

فلسفہ

داستانِ فلسفہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۱۶/-
ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی	ترجمہ	محمد صفدر میر	۲/۵۰
فلسفے کی نئی تشکیل	ترجمہ	انتظار حسین	۲/-

فنونِ لطیفہ

شاہکار تصاویر	ترجمہ و ترتیب	سید امتیاز علی تاج	۷/۵۰

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہلِ عرب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰
نیویارک سے پیرس تک پیدل پرواز	ترجمہ	گروپ کیپٹن فیاض محمود	۳/۵۰
یہ ہے شمالی افریقہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۲/۵۰

ناول، افسانے، ڈرامے

انجان راہی	ترجمہ	شان الحق حقی	۳/۵۰
بادبان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/-
بشر ہے کیا کہیے	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۶/۵۰
پہلا خون	ترجمہ	غلام حسین	۲/۵۰
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین	ترجمہ	اشفاق احمد	۶/-
دھوپ چھاؤں	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۷/-
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۳/۵۰
شہر پناہ	ترجمہ	ابنِ انشا	۲/۵۰
گھاس کا سمندر	ترجمہ	سید قاسم محمود	۱/۵۰
قیامت کی رات	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۷/-
معذور	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۴/۰
ننھی بی بیاں	ترجمہ	حجاب امتیاز علی	۵/۵۰

دستہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۲۱۹، لاہور

نئے پرانے	ترجمہ	محمد یوسف عباسی	۴/۰
ہمیں چراغ ہمیں پروانے	ترجمہ	قرۃ العین حیدر	۱۰/۰
ویران ہے دل	ترجمہ	قیسی رامپوری	۶/۰
اندھا کنواں	ترجمہ	ابن انشا	۷/۵۰
انوکھی کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۵/۰
بڑا ریچھ	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۳/۵۰
باپ کی نگری	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۶/۰
حیرت ناک کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۴/۰
قصص الحمرا	ترجمہ	سید وقار عظیم	۷/۵۰
خزانے کی تلاش	ترجمہ	شبلی ایم کام	۲/۵۰
سورج کے ساتھ ساتھ	ترجمہ	عشرت رحمانی	۶/۵۰
لاکھوں کا شہر	ترجمہ	ابن انشا	۳/۵۰
ایک حمام میں	ترجمہ	عشرت رحمانی	۳/۰
پھول کی پتی، ہیرے کا جگر	ترجمہ	ہلال احمد زبیری	۶/۰

نئی کتابیں

آدمی کی انسانیت	ترجمہ	مولانا محمد بخش مسلم	۷/۵۰
فلسفے کا نیا آہنگ	ترجمہ	بشیر احمد ڈار	۳/۵۰
کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن	ترجمہ	میجر آفتاب حسن	۱/۷۵
مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۷۵
کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالواحد	۱/۷۵

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، لاہور

... احمد ہارون موسیٰ

مُرقعِ اقوامِ عالم

اس سلسلے کی کتابوں کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو دُنیا کی برادری کی مختلف قوموں کی طرزِ زندگی ان کی ریخ اور ان کے ملکوں کے متعلق مستند اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ہر کتاب میں معلومات کے اوہ خوبصورت اور دلچسپ تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ کتابیں متعلقہ ملکوں ں سیاحت کرکے بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہیں۔ اس لیے ان میں مندرج معلومات بہت مستند ہیں۔

سرزمین اور باشندے	تصنیف	ترجمہ
آسٹریلیا	بلنڈن	عبدالحمید قریشی
بلجیم	لوڈر	غلام رسول مہر
	سپنسر	علی ناصر زیدی
	زکی نجیب محمود	ہاشمی فرید آبادی
	سٹریٹ	علی ناصر زیدی
	بریگڈن	عبدالحمید قریشی
	ورزکرش	عبدالحمید قریشی
یونان	گیاناکوس	عبدالحمید قریشی
ہالینڈ	بارنو	صادق علی دلاوری
انڈونیشیا	ڈیٹس سی سمتھ	ابوالحسن نغمی
اٹلی	ونوار	غلام رسول مہر
جاپان	واگان	غلام رسول مہر
سپین	لوڈر	ہاشمی فرید آبادی
ترکی	سپنسر	غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، لاہور، پشاور، حیدر آباد، کراچی